بچوں کے حکیم محمد سعید

حکیم محمد سعید کی زندگی کی کہانی، خود ان کی زبانی



نونہال ادب

بچّوں کے

حکیم محمّد سعید

حکیم محمد سعید کی زندگی کی کہانی، خود ان کی زبانی

نونہال ادب

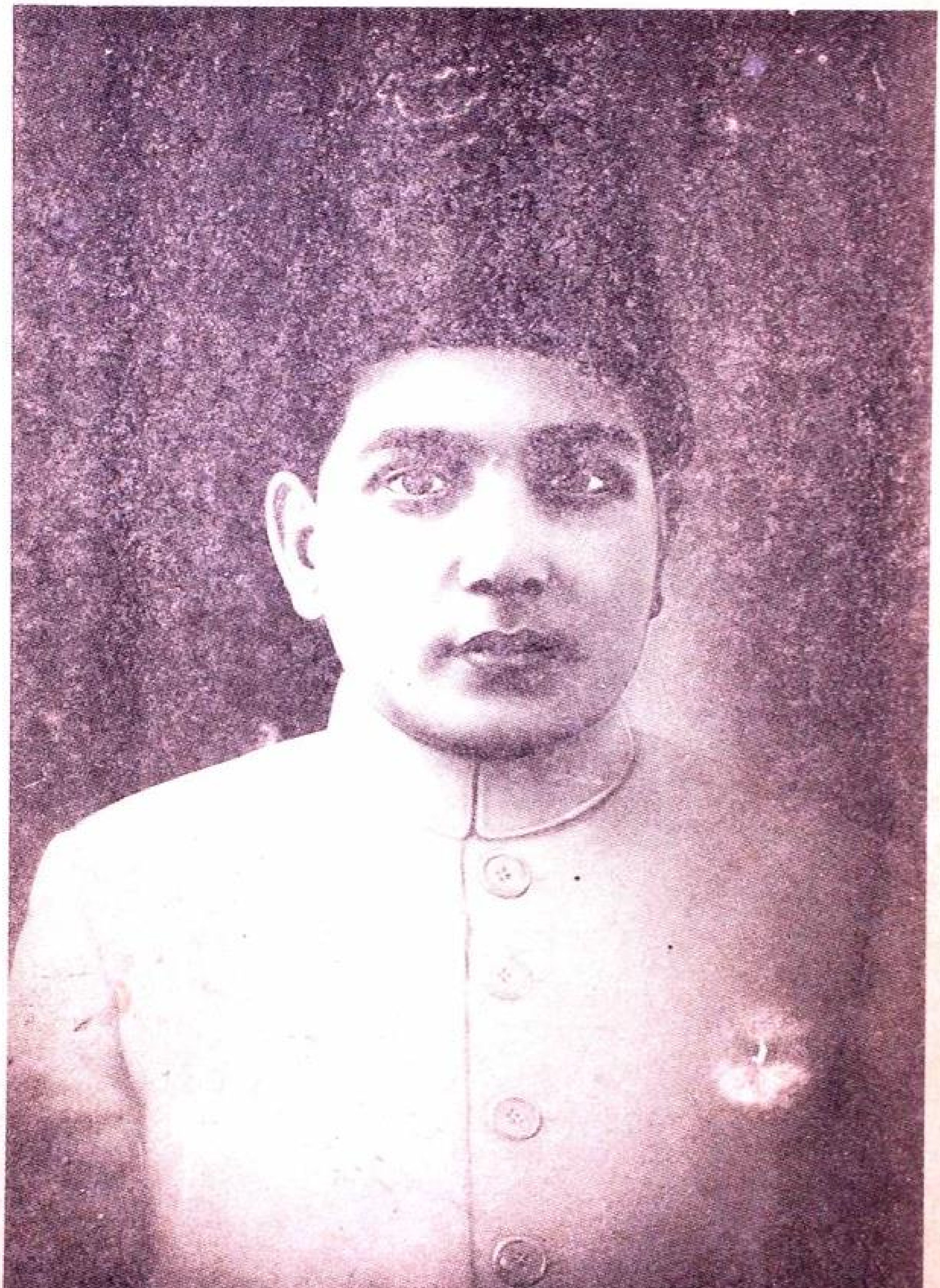
ہمدرد فاؤنڈیشن پریس، کراچی

مجلس ادارت

حکیم محمد سعید

مسعود احمد برکاتی - رفیع الزماں زبیری

مصنف	:	حکیم محمد سعید
ناشر	:	ہمدرد فاؤنڈیشن پریس ناظم آباد، کراچی ۷۴۶۰۰
طابع	:	ماس پرنٹرس، ناظم آباد، کراچی
اشاعت اول	:	۱۹۹۲ء
تعداد	:	۳۵۰۰
قیمت	:	دس روپے



حکیم محمد سعید - ۱۹۳۲ء

ترتیب

پہلی بات

مسعود احمد برکاتی

بچہ ہو یا بڑا، عورت ہو یا مرد کہانی سب ہی دل چسپی سے پڑھتے ہیں۔ کہانی اگر سچی ہو تو اس کی دل چسپی اور بڑھ جاتی ہے۔ اسی طرح بڑے لوگوں کی زندگی کے حالات اور خود ان کی لکھی ہوئی آپ بیتیاں بھی دل چسپی سے پڑھی جاتی ہیں۔ سوانح اور آپ بیتیاں سبق آموز بھی ہوتی ہیں۔ پڑھنے والے ان سے حالات کا مقابلہ کرنے، اپنا راستہ خود بنانے، مشکلات سے نہ گھبرانے اور زندگی گزارنے کا ڈھنگ سیکھتے ہیں۔ دنیا میں ایسا کون انسان ہو گا جس کو مشکل حالات سے واسطہ نہ پڑا ہو اور جس نے محنت اور لگن کے بغیر ترقی کی ہو۔ جو لوگ بڑے گھروں میں پیدا ہوتے ہیں ان کو بھی اپنا مقام اور اپنی عزت و اہمیت قائم رکھنے کے لیے کوشش کرنی پڑتی ہے، علم حاصل کرنا پڑتا ہے، اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کرنا پڑتا ہے۔

اس کتاب میں بھی ایک حقیقی زندگی کی کہانی ہے، یہ ایک ایسے انسان کی زندگی کے حالات ہیں جس نے اپنی زندگی خود بنائی، جس نے ایک ایسے فن کو عروج پر پہنچایا جس کو زمانے کی تیز رفتار ترقی کا ساتھ دینے میں مشکل پیش آ رہی تھی۔ اپنے ملک کی جڑی بوٹیوں سے دواسازی کو باقاعدہ ایک فن اور ایک صنعت بنا دیا۔ اس صنعت کو ایک باوقار مقام دیا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس صنعت کی آمدنی کو اپنی

ذات پر خرچ کرنے کے بجائے قومی کاموں پر خرچ کیا۔ خود بڑی لگن اور محنت سے علم حاصل کیا اور پھر علم کو پھیلانے اور اس کے فائدے عام کرنے پر اپنی پوری توانائی صرف کی۔ طب اور دوا سازی کو ترقی دینے کے علاوہ کتابیں لکھیں، رسالے نکالے، طب اور علم کی اشاعت کے لیے ملکوں ملکوں گھومے، کئی مفید ادارے قائم کیے۔ اسکول سے لے کر یونی ورسٹی تک کی بنا ڈالی۔

اس شخصیت کا نام ہے حکیم محمد سعید۔

محترم حکیم محمد سعید صاحب کی دوسری قومی خدمتوں کے علاوہ ایک اہم --- بہت اہم خدمت نونہالوں کی تعلیم، صحت اور تربیت کے لیے مسلسل کام ہے، اس مقصد کے لیے حکیم صاحب نے مستقل نوعیت کے کئی کام کیے۔ میں حکیم صاحب کے کارناموں کی تفصیل میں اس وقت اس لیے نہیں جانا چاہتا تھا کہ اس کتاب کے مطالعے سے آپ کو بڑی حد تک حکیم صاحب کی زندگی، شخصیت اور ان کے کاموں کا اندازہ ہو جائے گا۔

نونہالوں سے حکیم صاحب کے پیار کا نتیجہ یہ ہے کہ خود نونہال بھی حکیم صاحب کو ٹوٹ کر چاہنے لگے ہیں اور حکیم صاحب کے متعلق زیادہ سے زیادہ جاننا چاہتے ہیں۔ نونہال حکیم صاحب سے ملتے ہیں یا خط لکھتے ہیں تو وہ حکیم صاحب کی زندگی کے متعلق سوالات کرتے ہیں۔ وہ جاننا چاہتے ہیں کہ حکیم صاحب نے اتنی ترقی کیسے کی، اتنے کام کیسے کیے اور وہ اب بھی بڑے بڑے منصوبے مکمل کر رہے ہیں اور وہ انھی چوبیس

گھنٹوں میں جو ہم میں سے ہر شخص کو میسر ہیں اتنے مختلف قسم کے کام کیسے کر لیتے ہیں۔ نونہالوں کے اسی قسم کے سوالوں نے آخر حکیم صاحب کو اپنی زندگی پر قلم اٹھانے پر مجبور کیا اور یہ کتاب وجود میں آگئی۔ یہ کتاب حکیم صاحب کی زندگی کے سب تو نہیں، لیکن بہت سے گوشوں پر روشنی ڈالتی ہے، اور پھر لکھنے کا حکیم صاحب کا مخصوص انداز۔ مزے لے لے کر واقعات بیان کرنا اور صاف صاف باتیں کرنا۔ اسی طرح یہ ایک بہت دل چسپ اور مفید آپ بیتی بن گئی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اسے نونہالوں کے علاوہ بڑے بھی شوق سے پڑھیں گے۔

حال ہی میں جناب سید صفدر رضا نے بھی نونہالوں کی طرف سے کچھ سوالات بھیجے تھے اور ان کے جوابات لکھنے کی فرمائش کی تھی۔ اس کتاب میں سید صاحب کے سوالات کے جوابات بھی آگئے ہیں۔

نونہالوں کے لیے حکیم صاحب کے سفر ناموں اور ڈائریوں کے علاوہ یہ کتاب بھی ادب اطفال میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔

میرا نام

میرے محترم نونہالو ! میرا نام محمد سعید ہے۔ جب ہندستان اور پاکستان ایک تھے تو یہاں ایک بڑے اچھے انسان تھے : حضرت مولانا احمد سعید۔ ان کو سحبان الہند کہا جاتا تھا۔ نونہالو! سحبان ایک عرب شاعر تھا۔ بڑا قادر الکلام، فصاحت میں کامل اور بلاغت میں یکتا۔ جناب مولانا احمد سعید صاحب دین کے عالم تھے۔ اسلام ان کی زندگی تھا۔ جب تقریر کرتے تھے تو لوگ جھوم اٹھتے تھے۔ ان کی زبان سے جو لفظ نکلتا تھا وہ غلطی سے پاک ہوتا تھا۔ خوش بیان تھے۔ حالات کے مطابق بات کرتے تھے۔ اسی کو فصاحت اور بلاغت کہتے ہیں کہ کوئی زبان و کلام کی غلطی نہ ہو۔ ایک ایک لفظ کا زیر زبر صحیح ہو۔

نونہالو! بتایا یہ گیا ہے کہ انھوں نے میرا نام رکھا تھا۔ خود میرے والد محترم دینی انسان تھے۔ علما کے ساتھ ان کا گہرا تعلق رہتا تھا۔ میں جب بڑا ہوا تو مولانا احمد سعید صاحب کی تقریریں سننے کا بھی اتفاق ہوا۔ ان سے باتیں کرنے کا بھی موقع ملا۔ وہ ہمارے گھر کھانے پر بھی آیا کرتے تھے۔

پھر ہوا یہ کہ پاکستان کی تحریک شروع ہوئی۔ حضرت مولانا احمد سعید علما کے اس حلقے میں تھے جو ہندستان کو تقسیم کرنا نہیں چاہتے تھے۔ پاکستان کے خلاف تھے۔ مگر میں نے ان سے سیاست کی کوئی بات نہیں کی۔

میں ۹ جنوری ۱۹۲۰ء کو صبح چار بج کر سترہ منٹ پر پیدا ہوا تھا۔ ہجری تاریخ ۱۶ ربیع الثانی تھی اور سنہ تھا ۱۳۳۸۔ ان دنوں میرے والد محترم ہمدرد کو بڑھانے کی جدوجہد کر رہے تھے۔ انھوں نے ہمدرد کو بڑا بنانے میں اپنی صحت اور اپنی زندگی داؤ پر لگادی۔ وہ ہمدرد کو خدمت خلق کا ایک بڑا مرکز بنانا چاہتے تھے۔ انھوں نے اتنی محنت کی' اتنی محنت کی کہ آخر کار بیمار ہوگئے۔ اور ایسے بیمار ہوئے کہ لال کنواں' دہلی پر جو انھوں نے دو سال شدید محنت کرکے ہمدرد دواخانہ بنایا تھا وہ اس کا افتتاح خود نہ کر سکے۔

نونہالو! اس بڑے دواخانے کا فرنیچر تک انھوں نے خود بنایا تھا' رنگ روغن بھی خود کیا تھا۔ آخر ۱۹۲۲ء میں تھک کر ان کا انتقال ہوگیا۔ مجھے وہ بالکل یاد نہیں ہیں۔ وہ مجھ سے بڑی محبت کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ میرا سعید بڑا حکیم بنے گا اور اس کا دنیا میں نام ہوگا۔

میری والدہ اکثر کہتی تھیں : "سعید خوب محنت کرو' خوب پڑھو' تمھارے اباجان تم کو بہت بڑا انسان بنانا چاہتے تھے۔ تم اسے نہ بھولنا۔" مجھ پر ان باتوں کا بڑا اثر ہوتا تھا۔

میرا خاندان

میرے والد محترم کا نام تھا حکیم حافظ محمد عبدالمجید۔ میرے دادا کا نام شیخ رحیم بخش تھا۔

نونہالو ! میرے والد محترم بہت اچھے حافظ تھے۔ ان کو "حافظ

دہلی" کہا جاتا تھا۔ وہ جب شبینے میں قرآن حکیم پڑھنے کھڑے ہوتے تو دو رکعتوں میں دس پارے پڑھ دیتے تھے اور ایک لفظ بھی نہیں بھولتے تھے۔ بہت تیز پڑھتے تھے اور ایک ایک لفظ صاف صاف سمجھ میں آتا تھا۔ دہلی میں اس اعتبار سے بھی ان کی بڑی شہرت تھی!

نونہالو ! ان کی دوسری شہرت دیانت داری تھی۔ دہلی میں ان کو دیانت دار حافظ کہا جاتا تھا۔ جب انھوں نے ۱۹۰۶ء میں ہمدرد قائم کیا تھا تو ان کی دکان کا سائز ٦ فیٹ × ١٠ فیٹ تھا۔ میری والدہ کے والد، یعنی میرے نانا حافظ کریم بخش نے ان کو دو سو رپے قرض دیے تھے۔ اس زمانے میں دو سو رپے آج کے دو لاکھ کے برابر ہوئے۔ اس طرح ہمدرد شروع ہوا۔ میری والدہ کہتی تھیں کہ جب تک یہ قرض ادا نہیں ہوا میرے والد سخت بے چین رہتے تھے۔ آخر یہ قرض ادا ہوگیا۔ ہمدرد کا نباتات، جڑی بوٹیوں کا کام چل نکلا۔ میرے والد نباتات کے ماہر تھے۔ دہلی شہر میں صحیح اور خالص نباتات کا مرکز ہمدرد ہی تھا۔

نونہالو ! ایک بات اور! میرے والد محترم نے ہندستان کے مشہور حکیم حافظ محمد اجمل خاں صاحب کے ساتھ کام کیا تھا۔ ایک بار میرے والد کو نہ جانے کس وجہ سے یہ شبہ ہوا کہ حکیم اجمل خاں کو ان کی راست بازی پر ذرا شبہ ہوگیا ہے۔ میرے والد نے فوراً حکیم اجمل خاں سے تعلق ختم کرلیا اور ہمدرد کی بنیاد ڈال دی۔ حکیم حافظ محمد اجمل خاں کو حالات کا علم ہوا تو وہ میرے والد کے پاس آیا کرتے تھے اور اظہار افسوس کرتے تھے۔

نونہالو ! چلو ایک واقعہ اور سنائے دیتا ہوں۔ جب میرے والد نے دو سو روپے قرض ادا کردیا تو پھر ان کی ہمت جواں ہوگئی۔ جڑی بوٹیوں کا کاربار چمک اٹھا۔ آمدنی ہوتی رہی۔ میرے والد رات جب گھر آتے تو ساری بکری (فروخت) میری والدہ کے حوالے کردیتے تھے۔ میری والدہ نے مجھے بتایا کہ وہ رقم گن گن کر ان کو بتا دیتی تھیں۔ مگر اس میں سے کچھ نہ کچھ چھپالیا کرتی تھیں۔ میری والدہ کی یہ چوری میرے والد کے علم میں آتی رہتی تھی۔ مگر وہ خاموش رہتے تھے۔ ۱۹۰۶ء کے بعد ۱۹۲۰ء آگیا۔ کاربار جاری رہا۔ حوض قاضی کی چھوٹی سی دکان سے ہمدرد لال کنویں پر ذرا بڑی دکان میں آگیا تھا۔ پھر ایک بہت بڑی دکان سامنے ہی خریدنے کا مرحلہ درپیش ہوا۔

میرے والد محترم نے میری والدہ سے کہا : ”رابعہ خانم ! دکان تو خریدنی ہے۔ کام کو بڑھانا ہے، مگر میں رقم کہاں سے لاؤں۔ سخت پریشان ہوں“۔ میری والدہ بتاتی تھیں کہ میں ٹال ٹال جاتی تھی۔ آخر ایک روز کیا ہوا کہ تمھارے والد خاصے پریشان دکھائی دیے۔ مجھے رحم آگیا۔ میں نے تمھارے والد کو ساتھ لیا اور گھر کی کوٹھڑی میں ان کے ساتھ گئی۔ دیوار کے مٹی کے پلاسٹر کو توڑا۔ دیوار کے اندر سے صندوقچی نکال کر ان کے حوالے کردی۔ اب جو صندوقچی کھولی اور رقم گنی تو ۲۲ ہزار روپے نکلے! یہ میری والدہ نے ”چوری“ کیے تھے اور وقت بے وقت کے لیے جمع کیے تھے، آج کام آگئے۔

میری والدہ بتاتی ہیں کہ وہ اس قدر خوش ہوئے کہ آنسو بہ نکلے۔

اس طرح ہمدرد کے لیے بڑی شاندار دکان خرید لی گئی اور ہمدرد دواخانہ اس طرح ایک بڑا دواخانہ بن گیا۔

میں دہلی میں پیدا ہوا۔ دہلی تو راج دھانی تھی۔ مغلوں کے زمانے میں بھی اور انگریزوں کے زمانے میں بھی۔ میں جب ۱۹۲۰ء کی ۹ جنوری کو دہلی میں پیدا ہوا تو ہندستان انگریز کا غلام تھا۔ پھر جب میں بڑا ہوا تو میں نے اپنے چاروں طرف ان لوگوں کو دیکھا کہ جو انگریز کے خلاف تھے۔ انگریز کو ہندستان سے نکال دینا چاہتے تھے۔ آزادی چاہتے تھے۔ ان بزرگوں کی باتیں بڑے غور سے سنا کرتا تھا اور ان پر غور کرتا تھا۔ پھر میرا دل بھی انگریز کے خلاف ہوگیا تھا اور میرا دماغ بھی۔ مجھے افسوس ہوتا تھا کہ میں ایک غلام ملک میں پیدا ہوا ہوں۔ غلامی تو بڑی شرم کی بات ہے۔ مجھے بڑی شرم آتی تھی کہ میں غلام ہوں۔

نونہالو ! ایک دل چسپ واقعہ تم کو سناتا ہوں۔ جب میں اچھا خاصا بڑا ہوگیا اور ہمدرد کا کام میں نے سنبھال لیا تو مجھے ایک خط دہلی کے کمشنر کو لکھنا پڑا۔ کاروباری خط تھا۔ انگریز کمشنر تھا۔ نام تھا اسکو لتھ۔ بڑا دبدبہ تھا۔ بڑا رعب تھا۔ اس وقت قاعدہ یہ تھا کہ خط کے آخر میں جہاں دستخط کرنے ہوتے ہیں وہاں اردو میں آپ کا مخلص' آپ کا دوست وغیرہ لکھا جاتا تھا ۔ انگریز کو جب ان دنوں خط لکھا جاتا تھا تو آخر میں لکھنے کا قاعدہ تھا کہ YOUR MOST OBEDIENT SERVANT یعنی آپ کا بڑا فرماں بردار خادم۔

نونہالو ! جب خط تیار ہوکر آیا تو میں نے اس خط پر دستخط کرنے

سے انکار کردیا۔ میں نے جناب محترم بھیا احسان الحق صاحب سے کہا : "میں انگریز کا فرماں بردار خادم نہیں ہو سکتا۔" بھیا جی میرٹھ کے رئیس تھے۔ بڑے عالم فاضل انسان۔ مصور فطرت حضرت خواجہ حسن نظامی نے ان کو فقیر عشقی کا خطاب دیا ہوا تھا۔ بھیا جی کی شہر میں بڑی عزت تھی۔ ہر انسان ان کی عزت کرتا تھا۔ حضرت خواجہ حسن نظامی کی وجہ سے آپ ہمدرد کے ساتھ ہو گئے تھے اور حسابات کے ماہر تھے۔ ہمدرد کا وقف نامہ ان کا ہی لکھا ہوا ہے۔ ان کی مدد جناب منشی صاحب نے بھی کی تھی۔ ہمدرد میں مشیر اعلا جناب بھیا احسان الحق نے مجھے بہت سمجھایا کہ قاعدہ یہی ہے، مگر میں نے دستخط کرنے سے انکار کردیا۔ آخر بھیا جی نے میری مرضی کے مطابق لکھا : آپ کا مخلص (YOURS FAITHFULLY)۔ میں نے اس خط پر دستخط کردیے۔ انگریز کے خلاف میری یہ پہلی بغاوت تھی!

میں انگریز کا ہمیشہ باغی رہا ہوں، اس لیے سیاست کے باہر رہ کر بھی میں آزادی ہند کی ہر تحریک کا ساتھ دیتا تھا۔ انگریز مجھے پسند نہ تھا۔ مگر ایک بات ضرور تھی کہ انگریز ہندستان میں بے ایمان نہیں تھا۔ یعنی اس نے رشوت وغیرہ کا بازار گرم نہیں ہونے دیا تھا۔ کاربار زندگی میں وہ جھوٹ نہیں بولتا تھا۔ صاف بات کرتا تھا۔

میرے بھائی جان کی یہ خواہش تھی کہ ہمدرد کا اپنا ڈاک خانہ ہونا چاہیے۔ اس سلسلے میں میں نے سکرٹری وزارت مواصلات سے ملاقات کی۔ نام مجھے یاد ہے۔ سر ہیرالڈ شوبرٹ! میں نے درخواست کی ہمدرد

ڈاک خانہ منظور کیا جائے۔ فائل پر اتفاق رائے نہیں تھا۔ مگر میں نے شوبرٹ صاحب کو مطمئن کردیا۔ انھوں نے اپنے اختیار سے ہمدرد ڈاک خانہ منظور کردیا اور خود آکر افتتاح بھی کردیا۔

نونہالو! میری والدہ محترمہ کا نام رابعہ بیگم تھا۔ نانا کا نام شیخ کریم بخش تھا۔ میری والدہ نہایت نرم مزاج خاتون تھیں، مگر ساتھ ہی گرم مزاج بھی تھیں۔ ساری زندگی اصول پسند رہیں۔ اصول کے خلاف کوئی کام نہیں کرنے دیتی تھیں۔ ان کی تربیت کا سارا زور اخلاق پر تھا۔ بد اخلاقی پر وہ سخت سے سخت سزا دیتی تھیں۔ ایک بار ایسا ہوا کہ دستر خوان پر ہم سب ادب کے ساتھ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ مجھے کسی بات پر زور کی ہنسی آگئی۔ محترمہ والدہ صاحبہ نے مجھے دستر خوان سے اٹھا دیا۔ کھانے پر جہاں بڑے اور بزرگ بیٹھے ہوں وہاں ہنسنا تہذیب اور اخلاق کے خلاف ہے۔

نونہالو! میری والدہ نماز روزے کی سخت پابند تھیں۔ میں نے رات کو سوتے وقت ہمیشہ ان کو جا نماز پر دیکھا اور صبح میں اٹھتا تو والدہ صاحبہ جا نماز پر ہوتی تھیں۔ مرتے دم تک ان کو میں نے نماز روزے کا پابند دیکھا۔ وہ مجھے بھی نماز روزے کا پابند رکھتی تھیں۔ کیا مجال کہ ہم بھائی بہن نماز نہ پڑھیں!

ایک دردناک کہانی

نونہالو! میں تم کو ایک کہانی ضرور سناؤں گا۔ میرے والد کا انتقال

۱۹۲۲ء میں ہوگیا۔ میں تو دو سال ہی کا تھا۔ بھائی عبدالوحید سات سال کے تھے۔ بڑے بھائی عبدالحمید ۱۲ سال کے تھے۔ ہمدرد دواخانہ تو اس وقت بہت بڑا تھا۔ میری والدہ پردہ دار خاتون تھیں اور اب تنہا تھیں۔ خاندان کے مسائل پیدا ہوئے۔ میرے دادا رحیم بخش صاحب نے ہمدرد پر قبضہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ میرے چچا اپنے والد کے ہم نوا تھے۔ بات اس قدر بڑھی کہ ان دونوں نے میری والدہ کو گھر سے باہر نکال دیا۔ ان کو سخت ایذائیں پہنچائیں۔ اس شدید حالت میں میری والدہ نے بڑی ہمت سے کام لیا۔ انھوں نے اپنے بھائی حافظ نور محمد سے مدد لی اور ہمدرد کے ایک خادم اور میرے والد کے رفیق منشی مشرف علی بدایونی بھی مدد گار ہوئے اور بڑی مشکل سے ہمارے دادا اور چچا دست بردار ہوئے۔ ان کا کہنا تھا کہ میرے بیٹے اور میرے بھائی کا کاربار ہے۔ مالک ہم ہیں۔ حال آں کہ ان کو کوئی حق نہ تھا۔ انھوں نے میری والدہ کی بڑی بے عزتی کی تھی۔ میری والدہ نے یہ حالات ہم تک پہنچائے۔ اس لیے ہم اپنے دادا اور اپنے چچا سے دور رہتے تھے۔ مگر میری والدہ محترمہ نے حالات کو سنبھال لیا۔ اگر وہ ہمت نہ کرتیں اور پردے میں رہ کر کاربار پر نگاہ نہ رکھتیں تو ہمدرد باقی نہ رہتا۔ ہمارے خاندان کی یہ ایک بڑی دردناک کہانی ہے۔

میری والدہ نے بڑی جرات مندانہ زندگی گزاری ہے۔ وہ نہ صرف ہمدرد پر گہری نگاہ رکھتی تھیں بلکہ خاندان کی وہ لیڈر بھی تھیں۔ کیا مجال کوئی ان کی بات ٹال دے۔ خاندان کے اکثر فیصلے وہی کرتی تھیں۔ ان کی مرضی کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھ سکتا تھا!

نونہالو ! میرے والد محترم کا گھرانا پیلی بھیت سے شروع ہوتا ہے۔ ہندستان میں مشہور مقام بریلی سے کوئی دس بارہ اسٹیشن دور پیلی بھیت شہر ہے۔ میری والدہ کا تعلق پانی پت سے ہے۔ ہندستان میں پانی پت بڑا مشہور ہے۔ پانی پت کے میدانوں میں بڑی جنگیں ہوئی ہیں۔

ہم کل پانچ بھائی بہن ہیں۔ سب سے بڑی بہن حمیدہ بیگم، ان سے چھوٹے بھائی عالی جناب حکیم حاجی عبدالحمید، ان سے چھوٹی بہن محمودہ بیگم، پھر ایک بھائی حافظ عبدالوحید اور سب سے آخر میں محمد سعید۔ بھائی عبدالوحید کا انتقال عین جوانی میں ہوا۔ عین اسی مرض میں جس میں میرے والد محترم کا انتقال ہوا تھا۔ باقی ہم سب اللہ کا شکر ہے زندہ تابندہ ہیں۔ بڑی بہن تو اب ۸۸ سال کی ہوگئی ہیں۔ نماز روزے کی سخت پابند ہیں۔ صبح تہجد کی نماز بھی پڑھتی ہیں۔ اب تک اپنے کام خود کرتی ہیں۔ میرے ساتھ رہتی ہیں!

دینی تعلیم و تربیت

نونہالو ! تم میری تعلیم کی بات نہ پوچھو! میں تو کسی اسکول میں گیا ہی نہیں! اب تم ہی بتاؤ کہ میں تم کو کیا بتاؤں!

یہ تم نے خوب سمجھ لیا ہے کہ میں نے ایسے ماحول میں آنکھیں کھولیں کہ جو سراسر مذہبی تھا اور دینی۔ حضرت خواجہ باقی باللہؒ دہلی کے ایک نہایت بزرگ اللہ کے بندے تھے۔ ولی اللہ تھے۔ دہلی کے ایک

بڑے بزرگ حضرت اخوند جیؒ ان کے سلسلے کے تھے۔ میرے والد ان کے مرید تھے۔ ہمارے خاندان کا تعلق دین کے بزرگوں سے رہا ہے۔ اس لیے میری تعلیم بھی اسی انداز سے ہوئی۔

محترمہ والدہ صاحبہ کا فیصلہ تھا کہ سب سے پہلے تعلیم قرآن حکیم کی ہوگی۔ اول ناظرہ اور پھر حفظ' اس کے بعد دوسری تعلیم! اس فیصلے کے آگے کوئی دم نہیں مار سکتا تھا!

میری سب سے پہلی استانی چچی جان بنیں۔ سب لوگ ان کو چچی جان کہا کرتے تھے۔ مجھے تو آج بھی ان کا نام معلوم نہیں ہے۔ ہاں ان کے دین دار شوہر کا نام داروغہ رحیم بخش تھا۔ حوض قاضی دہلی کے تھانے میں نگراں تھے۔ ان کا بڑا دبدبہ تھا۔ ہم ان کو چچا جان کہا کرتے تھے۔ میں ان کو بھی اپنا استاد کہتا ہوں۔ میں ابھی تین ہی سال کا تھا کہ مدرسہ قرآن میں بٹھادیا گیا۔ مدرسہ کیا تھا۔ یہ چچی جان کا گھر تھا اور وہ شوقیہ بلکہ ثواب کے لیے بچوں کو قران کی تعلیم دیا کرتی تھیں۔ میں یہ کہتا ہوں کہ محترم چچا جان بڑے دیانت دار بزرگ تھے۔ ان کے ہاں ایک ہی وقت کھانا پکتا تھا۔ دونوں وقت وہی کھاتے پیتے تھے۔ گزر اوقات بہ مشکل ہوتی تھی۔ اس لیے محترمہ چچی جان کپڑا فروخت کرتی تھیں۔ ان کے ایک بھائی تھے۔ نام عبدالجبار تھا۔ بڑے غصیلے انسان تھے۔ ان کو دیکھ کر ڈر لگتا تھا۔ اس زمانے میں کپڑوں کے ٹکڑوں (کٹ پیس) کا دور تھا۔ کٹ پیس کے تکیے بنادیے جاتے تھے۔ چچی جان یہ تکیے منگوایا کرتی تھیں۔ اب اگر قسمت اچھی ہے تو اچھے ٹکڑے نکل آئے' ان کو بیچ کر

گھر کا خرچ چلاتی تھیں۔

نونہالو ! تم نے دیکھا، تھانہ حوض قاضی کا انچارج اور اس کے گھر میں ایک وقت چولھا جلتا تھا۔ اس دور میں پولیس اس قدر دیانت دار ہوتی تھی! میری ابتدائی تربیت میں چچا جان کا بہت حصہ ہے۔ بڑے شفیق اور بڑے نفیس انسان تھے۔ سارا علاقہ ان سے محبت کرتا تھا۔

نونہالو ! چچا جان اتوار کی اتوار ہم تین چار بچوں کو دہلی کی سیر کرانے کے لیے لے جایا کرتے تھے۔ میں لازماً ہر گروپ میں ہوتا تھا۔ گویا دہلی کی سیر ہماری تعلیم کا ایک حصہ تھی۔ ایک اتوار کہیں اور دوسرے اتوار کہیں اور۔ روز قرآن کی تعلیم اور دہلی کے تاریخی مقامات کی اتوار کے اتوار سیر، خوب دل لگتا تھا۔ لو بھئی، میں نے ابھی عمر کے پانچ سال بھی پورے نہیں کیے تھے کہ قرآن حکیم ناظرہ ختم کرلیا!

نونہالو! جب ختم قرآن ہوا تو سب سے زیادہ خوش میری والدہ محترمہ تھیں۔ ان کو بڑی مشکل سے یقین آیا کہ میں نے قرآن حکیم ختم کرلیا۔ مجھے یاد ہے وہ چچی جان سے باتیں کررہی تھیں: ”بوا، سچ بتاؤ، سعید نے پورا قرآن ختم کرلیا ہے؟“ چچی جان نے بڑے فخر سے جواب دیا تھا: ”لو بی اور لو، تم کو یقین کیوں نہیں آتا!“

نونہالو ! اس محلے کی ایک بات مجھے یاد آتی ہے۔ یہاں ایک اکھاڑہ تھا۔ میں صبح آتے جاتے اور شام ماموں فضل کے کندھوں پر سوار جاتے یہاں جھانکا کرتا تھا۔ یہاں پہلوان ورزش کرتے تھے۔ ہمارے چچا جان کو یہ جگہ پسند نہیں تھی اس لیے وہ منع کرتے تھے کہ ادھر نہ جانا، مگر مجھے

وہاں تاکا جھانکی میں بڑا مزہ آتا تھا۔

ایک دفعہ میں نے دیکھا کہ اکھاڑے کی چکنی مٹی میں ایک پہلوان تیل ڈال رہا ہے۔ بڑی حیرت ہوئی۔ دوسرے دن دیکھا کہ پھاوڑے سے اکھاڑہ کھودا جارہا ہے اور نرم کیا جارہا ہے۔ کھدائی تو روزانہ کرنی ہوتی تھی!

یہ پہلوانی میں فراموش نہ کرسکا۔ بڑا ہوکر میں نے بھی استاد مہرخ خاں کے اکھاڑے میں جانا شروع کردیا تھا۔ لڑنت کرتا تھا اور ایک بار تو دنگل میں بھی کشتی لڑا تھا!

نونہالو! یہ بڑی دل چسپ داستان ہے۔ اس زمانے میں گاما پہلوان اور ان کے بھائی امام بخش پہلوان کا توتی بول رہا تھا۔ امام بخش رستم ہند اور گاما جی رستم زماں تھے۔ ان دونوں سے ملنے کو بڑا دل چاہتا تھا۔ ان کے ایک عزیز رحیم سلطانی پہلوان تھے ان دنوں رٹائر ہوگئے تھے۔ ان کی بڑی عزت تھی۔ ان سے ملا۔ ان کا فوٹو اب بھی میرے پاس ہے۔

گاما پہلوان سے ملاقات پاکستان میں ہوئی۔ وہ لاہور میں میرے مطب میں تشریف لائے تھے۔ ان کی عزت کے لیے کھڑا ہوگیا۔ بے قرار ہوکر میں نے ان کو سینے سے لگالیا۔ میں نے ان سے کہا کہ چھے سات سال کا تھا تو آپ سے ملنے کو دل چاہتا تھا۔ ملاقات اب ہوئی ہے۔ وہ بڑے خوش ہوئے۔ میں نے رستم زماں گاما پہلوان کے حالات پر ایک کتاب بھی تیار کرائی۔ جناب ادیب الملک نواب خواجہ محمد شفیع نے یہ

کتاب لکھی تھی۔ میں گاما جی سے ان کے آخر وقت تک ملتا رہا۔ ان کے گھر جاتا تھا۔ وہ بیمار ہوئے تو میں ان کے سرہانے تھا۔

نونہالو ! میری والدہ پڑھی لکھی نہیں تھیں۔ وہ قرآن حکیم کی تلاوت بھی نہیں کر سکتی تھیں، مگر وہ قرآن حکیم کی سطروں پر انگلی رکھ کر اور چلا کر روزانہ ایک سی پارہ پڑھتی تھیں۔ مگر انھوں نے اپنی سب اولاد کو پڑھایا لکھایا۔ میرے والد تو ابھی ۴۲ سال ہی کے تھے کہ ۱۹۲۲ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے مرنے کے بعد ہمدرد کا سارا کاروبار میری والدہ نے پردے میں رہ کر سنبھالا تھا۔ یہ کہانی میں تم کو سنا چکا ہوں۔ ایک تو تعلیم یافتہ نہ تھیں۔ پھر سخت پردہ کرتی تھیں۔ مگر پھر بھی حکومت کرتی تھیں۔

نونہالو ! اب تو مزہ آگیا۔ بڑی شاندار تقریب ہوئی۔ آمین کی تقریب! اس زمانے (۱۹۲۵ء) میں ختم قرآن کی تقریب بڑی شاندار ہوتی تھی۔ اسے آمین کی تقریب بھی کہتے ہیں۔ مجھے اپنی آمین کی تقریب خوب یاد ہے۔ میں دولھا بنایا گیا تھا۔ کم خواب کی سفید شیروانی بنی تھی۔ بڑی بھڑک دار تھی۔ اس کی بھڑک مجھے آج بھی یاد ہے۔ سہرا بندھا تھا۔ بدھی پہنائی گئی تھی۔ بہت سارے بچے بھی آئے تھے۔

نونہالو ! اس زمانے میں تین بڑی تقریبیں ہوتی تھیں۔ بسم اللہ کی تقریب یعنی تعلیم قرآن شروع کرنا۔ آمین کی تقریب یعنی ختم قرآن اور ایک بڑی تقریب بچے کا پہلا روزہ رکھوانا۔ شادی بیاہ کی تقریبوں سے زیادہ خرچ ان پر کیا جاتا تھا۔

میری تقریب آمین میں بہت سارے بچے آئے تھے۔ مجھے یاد نہیں کہ اس کتاب کا نام کیا تھا۔ اس میں اشعار تھے۔ ایک بچہ ایک شعر پڑھ رہا تھا اور سارے بچے زور سے آمین کہہ رہے تھے۔ میرا خیال ہے کہ بیس پچیس شعر تھے۔ اتنی ہی بار گھر آمین سے گونج گونج اٹھا تھا۔ مجھے خوب یاد ہے۔ آمین کہنے والے سب بچوں کو میری والدہ نے تام چینی کی پلیٹوں میں کھوئے کی مٹھائی دی تھی۔ سبز رومال میں ہر پلیٹ بندھی ہوئی تھی۔ ہاں ہر بچے کو ہار پہنایا گیا تھا!

نونہالو! اسی آمین کی تقریب میں اعلان ہوا کہ محمد سعید اب قرآن شریف حفظ کرے گا۔ یہ اعلان میری والدہ کی طرف سے تھا۔۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ جب میں نے یہ اعلان سنا تو میرا تو دم نکل گیا تھا! سوچا' تو اب سارا قرآن حفظ کرنا پڑے گا! بڑی مشکل آئی!

مگر میں دم نہیں مار سکتا تھا۔ کوئی بھی بات نہیں کر سکتا تھا۔ یہ تو میری والدہ کا فیصلہ تھا۔ جہاں تک مجھے یاد آتا ہے میرے بڑے بھائی جان مجھے اسکول میں داخل کرانا چاہتے تھے' مگر ایسا نہیں ہو سکا۔

چچی جان حوض قاضی دہلی میں حویلی رضیہ بیگم میں رہتی تھیں۔ وہیں ایک اونچی مسجد تھی۔ اب بھی ہے۔ اسے گاڑی بانوں کی مسجد کہا جاتا ہے۔ اس مسجد میں ایک مدرسہ تعلیم القرآن تھا۔ اسے ایک انجمن تعلیم القرآن چلاتی تھی جس کا صدر دفتر فراش خانہ دہلی میں تھا۔ چچا جان نے فیصلہ کیا کہ محمد سعید کو یہاں قرآن شریف حفظ کرنے کے لیے داخل کر دیا جائے۔ چناں چہ چچا جان ہی مجھے وہاں لے گئے۔ مدرس

تھے : جناب حافظ سید عمردراز علی۔ مجھے ان کی شاگردی میں دیدیا گیا۔

حافظ سید عمر دراز علی صاحب زیادہ بوڑھے نہ تھے۔ صدر بازار دہلی میں ان کا گھر تھا۔ ان دنوں ٹرام چلتی تھی۔ شاید ایک پیسہ جانے آنے کا کرایہ تھا۔ حافظ صاحب وقت کے سخت پابند تھے' اور ویسے بھی سخت مزاج تھے۔ ان کو مرگی کی بیماری تھی۔ مہینے میں ایک بار ان کو مدرسے میں دورہ پڑ جاتا تھا۔ ان کو جب دورہ پڑتا تو سب لڑکے بڑے خوش ہوتے کہ اب چھٹی مل جائے گی، مگر مجھے دیکھ کر بڑا دکھ ہوتا تھا۔ سوچتا تھا کہ یہ کیا مرض ہے۔ لوگوں نے کہا تھا کہ مرگی ہے۔ مدرسہ تعلیم القرآن کا مہینے میں ایک بار معائنہ ہوتا تھا۔ انسپکٹر آتے تھے۔ بچوں کا امتحان لیتے تھے۔ میرا بھی امتحان ہوتا تھا۔ شاید اس مدرسے میں سب سے زیادہ قرآن مجھے ہی یاد ہوتا تھا۔ میرا کوئی مقابلہ نہ تھا۔

بچپن کا حج

نونہالو! میں نے دل لگا کر قرآن حکیم حفظ کرنا شروع کردیا۔ ابھی یہ تعلیم جاری تھی کہ میری والدۂ محترمہ نے حج کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ میں اور میرے دونوں بھائی ان کے ساتھ تھے۔ یہ ۱۹۲۷ء کی بات ہے۔ نونہالو! ہمارا یہ حج تقریباً پانچ مہینے میں ختم ہوا۔ "علوی" پانی کے جہاز کا نام تھا۔ کراچی سے اس جہاز میں سوار ہوکر گئے تھے۔ "حسین" نامی جہاز سے کراچی آئے تھے۔ یہ جہاز راستے میں خراب ہوگیا۔ دہلی خبر یہ پہنچی کہ

جہاز ڈوب گیا۔ سب نے فاتحہ پڑھ لی!

نونہالو! حج کے واقعات تو اس قدر دل چسپ ہیں کہ میں شاید ایک پوری کتاب میں لکھ دوں۔ سب سے پہلا کام تو یہ کیا کہ ہم تینوں بھائیوں نے جہاز کے انگریز کپتان سے دوستی کرلی۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ ہم زیادہ تر جہاز کے عرشے پر سیر کرنے لگے۔ ہم غریب تھے۔ سفر ڈیک میں کر رہے تھے۔ یعنی جہاز کی سب سے نیچے کی منزل کا ٹکٹ تھا۔ یہاں کھلا میدان تھا۔ سیکڑوں آدمی ذرا ذرا سی جگہ بستر لگائے پڑے رہتے تھے۔ بڑی گھٹن تھی۔ بالآخر جہاں ہم تھے وہاں ایک دروازہ بھی تھا۔ کپتان نے ہوا اور روشنی کی آمد و رفت کے لیے اسے کھولنے کی اجازت دے دی۔ پھر ہمارا یہاں دل لگا۔ ہماری شرارتوں کی وجہ سے ہماری والدہ محترمہ کو یہ ڈر لگا رہتا تھا کہ ہم میں سے کوئی اس دروازے سے سمندر میں نہ گر پڑے۔ ہم تو نہ گرے، مگر گاہے گاہے مچھلیاں تڑپ تڑپ کر اندر آگرتی تھیں! ان کو پکڑنا بھی ایک دل چسپ کھیل بن گیا تھا۔

نونہالو! حج کا ایک واقعہ تو آج بھی یاد ہے۔ ہم شہر مکۃ المکرمہ میں مقیم تھے۔ وہاں ایک پرائیویٹ گھر تھا۔ اس زمانے میں ہوٹل کہاں ہوتے تھے۔ بس وہاں کے رہنے والے اپنے گھروں میں حاجیوں کو ٹھیرایا کرتے تھے۔ کمانے کا یہ طریقہ تھا۔

ایک دن نیچے بازار میں شور مچا: حرامی، حرامی! نیچے دیکھا تو انسانوں کا ٹھٹ لگ چکا تھا۔ پھر دیکھا کہ میدان کے بیچوں بیچ ایک گڑھا کھودا گیا۔ یہاں ایک لوہے کا سریا جمایا گیا۔ اتنے میں کیا دیکھا کہ انگیٹھی آئی۔ اس

پر تیل کی کڑھائی۔ تیل گرم ہو رہا تھا۔ میں حیران کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ اتنے میں ہٹو بچو میں ایک آدمی پکڑ کر لایا گیا۔ ایک آدمی نے اس کا ہاتھ لوہے کے سریے سے باندھ دیا۔ اب ایک آدمی اور آگے آیا۔ اس نے تیز چھری سے لوہے سے بندھا ہوا اس کا ہاتھ کاٹ دیا اور اس کا بازو لوہے کی کڑاہی میں گرم تیل میں ڈبو دیا۔ وہ بے ہوش ہوگیا۔ معلوم ہوا کہ اس نے چوری کی تھی۔ اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا!

نونہالو! حج سے واپس آئے تو پھر تعلیم قرآن جاری ہوئی۔ ابھی عمر نو سال بھی نہ تھی کہ پورا قرآن حفظ کرلیا۔ ایسا حفظ کیا کہ مشکل سے چار پانچ جگہ بھولتا تھا۔

اوہو، نونہالو کیا پوچھتے ہو! ختم قرآن کی ایسی شاندار تقریب ہوئی کہ میں تم کو کیا بتاؤں۔ ہر انسان مجھ سے محبت کرتا تھا۔ مجھ پر فخر کرتا تھا!

نونہالو! تم نے میری دینی تعلیم کی بات کی تھی۔ میں نے تم کو ساری کہانی سنادی۔ اب تم مجھ سے سوال کر رہے ہو کہ دوسری تعلیم کیسے ہوئی؟ یعنی پرائمری تعلیم، مڈل تعلیم، ثانوی تعلیم، اعلا تعلیم، دیکھو بچو! تم نے بہت زیادہ سوالات کر ڈالے ہیں۔

عام تعلیم

میرے پیارے نونہالو! اب تک میں نے تم کو اپنی دینی تعلیم کا حال سنایا تھا۔ شاید میں تم کو یہ بتانا بھول گیا کہ جن دنوں میں قرآن حکیم

حفظ کر رہا تھا ان ہی دنوں چچا جان نے اردو کی کتابیں مجھے لاکر دینی شروع کردی تھیں۔ وہ ان کے پڑھنے میں میری مدد کرتے تھے۔ قرآن ناظرہ پڑھنے کے بعد اردو کا پڑھنا مشکل نہیں رہا تھا۔ اگرچہ میں اب چچی جان کے گھر کا شاگرد نہ تھا، مگر میں وہاں جاتا تھا۔ کہنا چاہیے کہ میرا ہیڈ کوارٹر یہی تھا۔ یہاں عصر کی نماز بچوں کو میں ہی پڑھایا کرتا تھا۔ بلکہ ان ہی دنوں میں کہ جب میں ناظرہ قرآن پڑھتا تھا مجھے امام بنا دیا گیا۔ سب بچے جماعت بناتے تھے۔ میں امام بنتا تھا۔ نماز پڑھاتا تھا۔ میں ہمیشہ اس پر فخر کرتا تھا، خوش ہوتا تھا!

نونہالو! میری تعلیم کے بارے میں فیصلہ یہ ہوا کہ یہ تعلیم کسی اسکول میں نہیں ہوگی بلکہ گھر میں ہوگی۔ ہوا یہ کہ میں نو سال کا ہوچکا تھا۔ اب اگر مجھے اسکول میں پہلی میں داخل کیا جاتا تو میں وہاں سب سے بڑا بچہ ہوتا۔ خود میں نے بھی کہا تھا۔ مجھے چھوٹے پانچ سال کے بچوں کے ساتھ پہلی جماعت میں بیٹھنے سے شرم آئے گی۔ بہت غور و فکر کر کے فیصلہ یہی ہوا کہ تعلیم اسکول میں نہیں ہوگی۔

خیر جناب سب سے پہلے میرے استاد جناب ماسٹر ممتاز حسین صاحب بنے۔ دہلی میں ان کی اچھی شہرت تھی۔ پہلی جماعت کی کتابیں آئیں۔ اردو، انگریزی، حساب، دینی کتاب وغیرہ، ابھی یہ کورس جاری تھا کہ ماسٹر ممتاز حسین صاحب کو بی۔ ٹی کرنے کے لیے لاہور جانا پڑا۔ ان کی جگہ جناب ماسٹر اقبال حسین ایم۔اے آئے۔ جناب اقبال حسین صاحب نے دہلی کی مشہور تعلیم گاہ سینٹ اسٹیفن کالج سے ایم اے کیا تھا اور پھر وہ

دہلی میونسپل کمیٹی میں کام کرنے لگے تھے۔ یہ وہی کالج ہے جہاں پاکستان کے صدر جنرل محمد ضیاء الحق نے بھی تعلیم پائی تھی۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب نے بھی یہاں ہی سے پڑھا تھا اور پھر دہلی یونی ورسٹی میں پڑھاتے تھے۔ انھوں نے انگریزی پر زیادہ :ر اس لیے دیا کہ میں اردو میں طاق تھا۔ میں نے اردو کی بہت ساری کتابیں خود ہی پڑھ ڈالی تھیں۔ اقبال حسین صاحب نے فرمایا: "محمد سعید کی اردو تو میٹرک کے طالب علموں سے کہیں زیادہ اچھی ہے۔" ان کی توجہ انگریزی پر رہی۔

نونہالو ! میں نے تین سال میں میٹرک سے زیادہ کی تعلیم حاصل کرلی بلکہ اردو کا تو جہاں تک تعلق ہے میں پوری صلاحیت سے پڑھ سکتا تھا اور خوب روانی سے لکھ سکتا تھا۔ میں ۱۲ سال کی عمر ہی سے رسالہ معارف (اعظم گڑھ)، رسالہ "نگار" (لکھنؤ) جیسے ادبی اور علمی جرائد کا مطالعہ کرتا تھا۔ دہلی کا ساقی (شاہد احمد)، لاہور کا ساربان، عالم گیر اور مولانا صلاح الدین کا ماہنامہ ادبی دنیا بھی پسندیدہ رسالے تھے۔ خواجہ حسن نظامی کا منادی ضرور پڑھتا تھا۔ اس میں میرا ذکر بھی گاہے گاہے ہوتا تھا۔ اس میں میرا نام "تھری ایچ محمد سعید" چھپتا تھا۔ شوکت تھانوی کی ساری کتابیں، مرزا فرحت اللہ بیگ کی کتابیں وغیرہ میں سب پڑھ چکا تھا۔ نعیم صدیقی کے افسانے بھی پڑھتا تھا اور ان سے متاثر تھا۔ نعیم صدیقی اب ایڈیٹر ترجمان القرآن ہیں۔ زبردست عالم ہیں۔ ان سے خط و کتابت آج تک جاری ہے۔

کسی نے مشورہ دیا کہ میٹرک پرائیویٹ امتحان دلوا دینا چاہیے۔ میں

تو تیار تھا۔ مگر فیصلہ یہ ہوا کہ اب عربی اور فارسی کی تعلیم ہونی چاہیے۔ اب تمام فیصلے میرے بڑے بھائی جان محترم کرتے تھے۔ میری والدہ نے قرآن حفظ کرنے تک عمل دخل رکھا۔ اس کے بعد انھوں نے مجھے بھائی جان محترم کے حوالے کردیا تھا۔

عربی اور فارسی کے لیے جناب مولانا قاضی سجاد حسین صاحب مقرر ہوئے۔ وہ مدرسہ عالیہ عربیہ 'مسجد فتح پوری' دہلی کے صدر مدرس تھے۔ یقیناً یہ ان کی قابلیت ہے کہ دو سال میں عربی اور فارسی بول بھی سکتا تھا اور لکھ بھی سکتا تھا۔ اس دوران ماسٹر اقبال حسین صاحب بھی مجھے ہائی ایجوکیشن دیتے رہے۔ ان دونوں محترم استادوں کا میں شکر گزار ہوں۔ ۱۵ سال کی عمر تھی کہ میں اردو پر تو خوب' انگریزی بھی اچھی اور بڑی حد تک فارسی اور عربی پر قادر ہو گیا تھا۔

تو میرے عزیز نونہالو! میری تعلیم کا حال تو تم نے سن لیا۔ ہاں ایک بات تم کو بتادوں۔ میں قرآن حکیم ہر سال نفلوں میں سنایا کرتا تھا۔ میں تو باقاعدہ تراویح پڑھانے کے لیے بے چین رہتا تھا۔ مگر عمر کم تھی۔ کوئی مجھے امام قبول اور تسلیم کرنے کو تیار نہ ہوتا تھا اور میں امام بننے کے لیے بڑا بے چین رہتا تھا! آخر چار سال کی عمر سے امامت کرتا آیا تھا! مولوی صاحبان کہتے تھے کہ بچے کے پیچھے نماز نہیں ہوگی! بڑا دل دکھتا تھا.... میرے مقابلے کا کوئی حافظ نہ تھا۔ میرے مد مقابل میرے خالہ زاد بھائی حافظ محمد الیاس تھے۔ سچی بات یہ ہے کہ وہ مجھ سے اچھے حافظ تھے۔ ان کا اور میرا مقابلہ عرصے تک جاری رہا۔ افسوس کہ دلی کے ہنگاموں

میں وہ قرآن حکیم ضائع ہوگیا جس پر ہمارا رکارڈ لکھا ہوا تھا کہ کتنی بھول چوک کب ہوئی۔ پورے قرآن میں پانچ چھے جگہ میں بھولتے تھے ہم دونوں بھائی! خیر، جب میں بارہ تیرہ سال کا ہوگیا تو مسجد حوض قاضی دہلی میں مجھے بڑوں کو نماز تراویح پڑھانے کا موقع دے دیا گیا۔ اس میں میرے محترم خالو ابا، جناب حاجی حافظ محمد زکریا صاحب کے اصرار و کوشش کو بڑا دخل تھا۔ پھر بھی میں آوازیں یہ ہی سنتا تھا! "ذرا دیکھو، یہاں تو بچہ نماز پڑھارہا ہے کیسے نماز ہوگی!" یہ سن کر میرا دل دکھتا تھا! مجھے یہ حرکت سخت ناگوار ہوتی تھی کہ جماعت میں سے کم عمر بچوں کو نکال کر ان کو پیچھے بھیج دیا جاتا تھا۔ میں اس حرکت کو آج بھی صحیح نہیں سمجھتا۔

خیر، پہلی بڑی تراویح پڑھائی اور ختم قرآن ہوا تو سب سے زیادہ جنھیں مسرت تھی وہ میری والدہ محترمہ تھیں۔ ختم قرآن پر تانبے کی تشتریوں میں بالو شاہی رکھ کر رومال میں باندھ کر تقسیم ہوئی۔ پورے شہر میں دھوم مچ گئی تھی! مجھے یاد ہے کہ مسجد حوض قاضی میں اس قدر ہجوم تھا کہ تین چار جوان تو حوض میں گر گئے۔ ایک ہزار تشتریاں کم پڑ گئیں!

حافظ بسم اللہ

نونہالو! میرے خالو جناب حافظ محمد زکریا بلند پایہ انسان تھے۔ دیانت دار۔ خلافت کے دور میں وہ خازن تھے۔ وہ بنگال میں کھڑگ پور

شہر میں تھے۔ حفظ قرآن سے گہرا لگاؤ تھا۔ خود بھی حافظ تھے۔ ان کا تکیہ کلام بسم اللہ الرحمٰن الرحیم تھا۔ زندگی میں اربوں بار بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھی ہوگی۔

اعلا تعلیم

نونہالو! تم نے اب اعلا تعلیم کی بات کی ہے۔

میری اعلا تعلیم طب کی تعلیم ہے۔ میرے بھائی کے ایک دوست تھے جناب حکیم ظہیر علی سہوانی۔ ان کو مقرر کیا گیا کہ آیورویدک اینڈ یونانی طبیہ کالج، قرولباغ، نئی دہلی میں میرا داخلہ کرادیں۔ میرے بڑے بھائی جناب حکیم عبدالحمید صاحب نے بھی ۱۹۲۷ء میں یہاں ہی طب کی تعلیم حاصل کی تھی۔ تو جناب حکیم سہوانی صاحب مجھے طبیہ کالج لے گئے۔ وہاں ان دنوں جناب حکیم مولوی عبدالحفیظ (سہوانی) رجسٹرار تھے۔ ان کے کمرے میں جب گئے تو میں ان سے واقعی ذرا ڈرا۔ تھے تو بڑے خوب صورت انسان۔ بڑی خوب صورت داڑھی، شیروانی زیب تن کیے۔ ہونٹ پان کی لالی سے سرخ، آنکھوں میں بریلی کا کاجل۔ ترکی اونچی باڑ کی ٹوپی۔ ہو بہو حکیم محمد اجمل خاں! مگر اصول کے بڑے پکے۔ ۱۴ سال کچھ ماہ عمر سن کر صاف کہہ دیا کہ طبیہ کالج میں ۱۶ سال داخلے کی عمر ہے۔ افسوس کہ داخلہ نہیں ہوسکتا۔ یہ دونوں حکیم سہوان کے تھے۔ آپس میں دوست بھی تھے۔ مگر دال نہ گلی۔ ہم واپس آگئے۔ حکیم ظہیر علی

صاحب نے میرے بڑے بھائی صاحب سے فرمایا :

"حکیم عبدالحفیظ بڑے سخت انسان ہیں۔ لاکھ منت سماجت کی۔ ٹس سے مس نہیں ہوئے۔ فرمایا، اگلے سال آنا، غور کروں گا۔"

نونہالو ! ان دنوں ڈاکٹر سید ناصر عباس پرنسپل تھے طبیہ کالج کے۔ انھوں نے میرا علاج کیا تھا۔ وہ ہندستان کے مشہور و معروف ڈاکٹر انصاری صاحب کے ساتھ بہ طور معاون کام کرتے تھے۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری ۱۹۳۵ء میں عروج پر تھے۔ مہاتما گاندھی ان کے ہاں ٹھیرا کرتے تھے۔ ان کے رفیق تھے۔ ہندستان کے بڑے لیڈر پنڈت موتی لال نہرو اور جواہر لال نہرو بھی ڈاکٹر انصاری کے دوست تھے۔ ہم نوالہ اور ہم پیالہ۔

نونہالو ! ہندستان میں ایک نہایت مشہور حکیم تھے، حکیم نابینا۔ ہندستان بھر سے مریض ان سے علاج کرانے کو آتے تھے۔ نام تھا حکیم عبدالوہاب انصاری۔ یہ حکیم صاحب ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے بڑے بھائی تھے۔ دونوں بھائی، ایک حکیم اور ایک ڈاکٹر دونوں عروج پر تھے۔

نونہالو ! ڈاکٹر مختار احمد انصاری نے میرا علاج کیا تھا۔ ۱۹۳۳ء میں ان کی فیس ۱۶ روپے تھی۔ ڈاکٹر انصاری کے مشورے کے مطابق ڈاکٹر سید ناصر عباس میرا علاج کرتے تھے۔

نونہالو ! ایک بڑی شرمندگی کی بات ہے۔ تم کو بتائے دیتا ہوں۔ تم سے کیا چھپانا! یہ شرمندگی مجھے آج تک یاد ہے۔ ڈاکٹر سید ناصر عباس

میرے پیٹ پر الٹرا وائلٹ ریز ڈال رہے تھے۔ انھوں نے مجھ سے سوال کیا کہ : "کیا تم الٹرا وائلٹ ریز کے بارے میں جانتے ہو کہ یہ کیا ہوتی ہیں؟" میں نے کہا : "نہیں"۔ وہ مسکرا کر خاموش ہو گئے۔ میرے بھائی جان سے انھوں نے سوال کیا :

".... آپ نے ان کو سائنس نہیں پڑھائی؟"

نونہالو ! ڈاکٹر سید ناصر عباس کا سوال اور میرا معذرت کا جواب! یہ شرمندگی مجھے آج تک ہے۔ بعد میں یہی شرمندگی مجھے نئی دہلی کے پوسا انسٹی ٹیوٹ میں لے گئی۔ وہاں ڈاکٹر رفعت حسین صدیقی کام کرتے تھے۔ وہ بلند پایہ سائنس داں تھے۔ ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی کے ساتھ بھی تھے۔ میں نے ان کی لیبورٹری میں کوئی ایک سال کیمسٹری پر عملی کام کیا تھا۔ اس ایک سال کی محنت اور ڈاکٹر رفعت حسین کی محبت نے سائنسی مزاج مجھے عطا کر دیا!

خیر میرے بھائی جان میرے طبیہ کالج میں داخلے کے لیے ڈاکٹر ناصر عباس صاحب سے ملے۔ میں نے تم کو بتایا کہ وہ پرنسپل تھے۔ انھوں نے مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ انھیں اور مجھے دونوں کو الٹرا وائلٹ ریز والا سوال یاد آگیا! اب تو میں بڑا سٹ پٹایا۔ یہ ضرور انکار کر دیں گے، مگر ایسا نہیں ہوا۔ دوسرے دن حکیم ظہیر علی صاحب مجھے پھر جناب حکیم عبدالحفیظ صاحب رجسٹرار کی خدمت میں لے گئے۔ وہ داخلے پر راضی ہو گئے۔ مگر کہا : "ان کو عربی پڑھنی ہوگی اور انگریزی بھی۔" اب میں نے ذرا جرات سے کہا : "میں یہ دونوں زبانیں جانتا ہوں!"

حکیم عبدالحفیظ صاحب نے ذرا غور سے مجھے دیکھا۔ ان کے چہرے پر مسکراہٹ آئی! اس طنز کا مطلب یہ تھا کہ جاؤ تم عربی، انگریزی کیا جانتے ہو گے!

نونہالو ! آدمی سخت تھے۔ عربی اور انگریزی کا امتحان لینا طے پایا۔ میں نے یہ امتحان دیا اور کام یاب ہوگیا! میں عربی اور انگریزی دونوں زبانیں بول بھی سکتا تھا! اب میں نے حکیم عبدالحفیظ کو طنز سے گھورا! میرا داخلہ طبیہ کالج دہلی میں ہوگیا۔

نونہالو ! طبیہ کالج کی پہلی جماعت میں مجھ سے زیادہ عربی داں جناب غلام محی الدین مجددی تھے۔ وہ ٹنڈو جام کے تھے۔ بعد میں ان کے لاکھ مرید ہوئے۔ گزشتہ سال اچانک انتقال ہوگیا۔ انگریزی میں خوب طاق جناب محمد احسن تھے۔ یہ کراچی کے تھے۔ اب حکیم محمد احسن ہیں۔ کون نہیں جانتا! یہ دونوں میرے ہم جماعت تھے! ہم تینوں طبیہ کالج میں خوب چمکے! سب پر سبقت رکھتے تھے۔ تینوں دوست رہے آج بھی دوست ہیں!

نونہالو ! یہ ہے اعلا تعلیم کا آغاز!

نونہالو ! اب ذرا چند دل چسپ باتیں بھی تم سن لو۔ اس سے تمھاری ہمت بلند ہوگی۔

جب میرا داخلہ طبیہ کالج میں نہیں ہو رہا تھا تو میں نے اسی وقت فیصلہ کرلیا تھا کہ میں خود ایک طبیہ کالج قائم کروں گا اور سب سے پہلے اپنا داخلہ وہاں کراؤں گا!

نونہالو ! میں نے پاکستان آکر ۱۹۵۸ء میں ہمدرد طبیہ کالج قائم کیا۔ اس کا افتتاح محترمہ فاطمہ جناح نے فرمایا۔ میرے قائم کردہ اس طبیہ کالج کے سب سے پہلے پرنسپل حکیم مولوی عبدالحفیظ ہوئے۔ وہی حکیم صاحب جنھوں نے مجھے طبیہ کالج دہلی میں داخلے سے انکار کردیا تھا! طبیہ کالج دہلی کے تین بڑے استاد بھی میرے ساتھ آگئے اور میرے قائم کردہ طبیہ کالج میں پروفیسر مقرر ہوئے۔ جناب حکیم سید نذیرالدین احمد (اناٹومی)، جناب ڈاکٹر میجر ظفریاب حسین (مڈویفری) اور جناب حکیم خواجہ رضوان احمد (فزیالوجی)۔

لو بھئی نونہالو ! اب میں تھک گیا ہوں۔ اب پھر باتیں ہوں گی۔

ہاں، میرے استادوں میں جناب ماسٹر ممتاز حسین اور جناب ماسٹر اقبال حسین دونوں نے ہمدرد پاکستان میں کام کیا۔ یہ دونوں پھر جماعت اسلامی پاکستان کے لیڈر بنے۔ ماسٹر (حکیم) اقبال حسین تو قائم مقام امیر جماعت اسلامی بھی ہوئے۔ یہ جماعت اسلامی ہے جس کا قیام دہلی میں میرے گھر میں عمل میں آیا تھا! یہ کہانی میں نے طلب کرنے پر لکھ کر اردو ڈائجسٹ کو دے دی ہے مگر وہ اسے دبائے بیٹھے ہیں۔

نونہالو ! جب صدر پاکستان فیلڈ مارشل ایوب خاں صاحب نے مجھے ستارۂ امتیاز عطا فرمایا تو میں قصر صدر سے سیدھا اپنے مکرم و محترم ماسٹر ممتاز حسین صاحب کے گھر گیا اور ستارۂ امتیاز کا میڈل ان کی خدمت میں پیش کردیا کہ آپ نے مجھے سب سے پہلے تعلیم دی تھی۔ وہ ان دنوں علیل تھے۔ استاد تھے۔ شفیق تھے۔ بے حد خوش ہوئے۔ بہت

دعائیں دیں۔

نونہالو ! زمانہ طالب علمی یعنی طبیہ کالج دہلی میں، میں نے مطلقاً کسی کھیل میں حصہ نہیں لیا۔ ہاں میں فٹ بال کوٹلہ گراونڈ میں کھیلتا تھا۔ بیڈ مشن کھیلتا تھا۔ نونہالو ! تم کو کیا بتاؤں، میں نے کیا کھیل نہیں کھیلا۔ میں سب سے زیادہ کھلنڈرا مشہور تھا۔ اگر وقت ملا تو تم کو بتاؤں گا اپنے کھیلوں کی کہانی! تفصیل سے ! مگر اب سب سے زیادہ توجہ میری طب کی تعلیم پر تھی۔ دراصل میں تو صحافی بننا چاہتا تھا۔ اخبار جاری کرنے کا ارادہ تھا۔ مگر طب خاندانی فن ہے۔ اس لیے میں نے اپنے بڑے بھائی جان محترم کی بات مانی اور طب کی تعلیم حاصل کی۔ اچھا ہوا کہ میں نے بھائی جان محترم کی بات مان لی۔ بزرگوں کا مشورہ بہت سوچ سمجھ کا ہوتا ہے۔ چھوٹوں کو ضرور ماننا چاہیے۔

نونہالو ! تمھارے دل چسپ سوال کے جواب میں میں یہ کہوں گا کہ مجھے اردو ادب سے گہرا تعلق رہا ہے۔ میں نے ۱۲ سے ۱۵ سال کی عمر تک ہندستان کے بڑے بڑے ادیبوں کی بہ کثرت کتابیں پڑھیں۔

انگریزی زبان سے مجھے زیادہ رغبت نہ تھی، مگر یہ وقت کی ضرورت تھی۔ اس لیے خوب پڑھی۔ فارسی سے ضرور شوق تھا۔ خوب بولتا۔ خوب سمجھتا تھا۔ عربی خوب سمجھ لیتا تھا۔ خوب بول نہیں سکتا تھا۔

کھیل

نونہالو ! اچھا اب میں تم کو یہ بھی بتاؤں کہ مجھے کون سے کھیل

پسند تھے۔ لو بھئی تمھاری خاطر کرتا ہوں، ذرا دل تھام لو :

✤ میرا سب سے پسندیدہ کھیل فٹ بال رہا ہے۔ میں نے اس میں مہارت پیدا کی۔ میں ہندستان کی سب سے ممتاز فٹ بال ٹیموں میں فرسٹ کلاس فٹ بال کھیل چکا ہوں۔

✤ میں بیڈ منٹن بھی کھیلتا رہا ہوں۔ اچھا کھلاڑی رہا ہوں۔

✤ میں اکھاڑوں میں ورزش (ڈنڑ بیٹھک) کا شوقین رہا ہوں۔ دنگل میں کشتی بھی لڑ چکا ہوں۔ پہلوانوں میں میرے سب سے پسندیدہ رستم زماں گاما پہلوان تھے۔ ایک بار تو میں نے "غصے میں آکر" گاما جی کو چیلنج کردیا تھا! مگر انھوں نے بڑی محبت سے جواب دیا! "ارے حکیم جی، کیوں بڑھاپے میں مجھے ہراتے ہو!" میں کہتا ہوں کہ میں گاما جی کا شاگرد ہوں۔ ان سے بڑا پہلوان دنیا نے پیدا نہیں کیا ہے۔

✤ میں نے شطرنج میں بہت نام پایا ہے۔ سندھ کے چیمپئن کو مسوری پہاڑ میں ایک زبردست مقابلے میں ہرادیا تھا۔ میں نے جب اسے چیلنج کیا تو میری عمر تیرہ چودہ سال تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر ہنسا اور بچے کے مقابلے میں کھیلنے سے انکار کردیا، مگر یہ مقابلہ ہوا۔ سندھ زمیندار ہوٹل مسوری (ہلز) میں ہوا۔ میں نے آٹھویں چال پر اسے مات دے دی۔

✤ پتنگ بازی میں بھی میں نے اچھی مہارت پیدا کی تھی۔ مقابلے بھی کیے۔

✤ موٹر سائیکل سے لونگ جمپ میرا بڑا دل چسپ مشغلہ رہا ہے۔ میں نے موت کے گولے میں بھی موٹر سائیکل دوڑائی اور چکرائی ہے۔

✤ پہاڑوں پر چڑھنا (ہائیکنگ) سے مجھے شوق رہا ہے۔ شملہ پہاڑ' مسوری پہاڑ میرے پسندیدہ پہاڑ رہے ہیں۔ یہاں بیس بائیس میل روز پہاڑیوں پر چڑھنا میرا معمول رہا ہے۔

✤ میں دہلی کا مشہور گل دم باز' کبوتر باز' مرغ باز' بٹیر باز رہا ہوں۔ میرے ہاں ایک ہزار سے زیادہ کبوتر رہے ہیں۔ میں کبوتر لڑایا کرتا تھا۔

✤ میں نے برج (تاش) بھی بہت کھیلا ہے۔

✤ گھڑ سواری میرا نہایت دل چسپ مشغلہ رہا ہے۔ میرا گھوڑا موتی نہایت شان دار گھوڑا تھا۔ اس کی پیٹھ پر سوار ہو کر ہوا سے شرط باندھنا میرا دل چسپ کھیل ہوتا تھا!

✤ کیرم کا وائی۔ ایم۔ سی۔ اے انڈیا کا ونر اور رنر رہا ہوں۔

✤ واہ وا! گلی ڈنڈا بھی کیا کھیل تھا!

✤ اور ہائے گولی تک (کینچے) پھینکنا بھی کیا خوب تھا!

✤ کبڈی بھی یقیناً مجھ سے جواں ہمت کا کام تھا!

✤ ٹیبل ٹینس میں بھی خوب مہارت حاصل کی تھی۔

✤ چٹاگانگ اور ڈھاکہ میں بلیرڈ کے ایسے ہاتھ دکھائے کہ لوگ حیران رہ رہ گئے!

✤ ٹینس تو میں آج تک کھیلتا ہوں' میرا ہم عمر بھلا کوئی مجھ سے جیت کر تو دکھادے!

تحریک پاکستان

نونہالو: تمھارے تحریک پاکستان کے سوال سے میرا دل خوش ہوا ہے۔

اللہ کا شکر ہے کہ میرے پاکستان کے نونہال پاکستان سے محبت کرتے ہیں اور پاکستان کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننا چاہتے ہیں۔

چلو بھئی، سب سے پہلے تو میں تم کو ایک نہایت دل چسپ بات بتاتا ہوں۔ دہلی میں بھی تحریک پاکستان زوروں پر تھی۔ وہاں ایک بچہ مسلم لیگ بھی تھی۔ پاکستان سپریم کورٹ کے جج جناب جسٹس محمد نعیم صاحب اور ہائی کورٹ سندھ کے جج جناب جسٹس ظہور الحق صاحب دونوں بچہ مسلم لیگ میں تھے۔ ہمارے ساتھ ایک بھیا عرفان الحق شبلی بڑا پرجوش نوجوان تھا۔

ہم نے طے کیا کہ چلو قائد اعظم محمد علی جناح کو لال کنویں لے چلیں۔ حوض قاضی، لال کنواں، فراش خانہ، فتح پوری، چاندنی چوک، لال قلعہ، جامع مسجد، یہ روٹ بنایا۔ قائد اعظم نے بات مان لی۔ شبلی کو ذرا دیکھو، نہ جانے کس طرح دہلی چڑیا گھر سے ایک ہاتھی لے آیا۔ اب ہم نے قائد اعظم سے کہا: جناب محترم، ہاتھی پر آپ کو سوار ہونا ہے! قائد اعظم نے صاف انکار کردیا۔ انھوں نے افغانستان کے امیر حبیب اللہ کی طرح یہ تو نہیں فرمایا کہ جس سواری کی راس میرے ہاتھ میں نہ ہو میں اس پر سواری نہیں کرسکتا، مگر انھوں نے ہمیں اونچ نیچ سمجھادی جو ہماری سمجھ میں آگئی۔ وہ موٹر میں سوار ہوئے۔ جب وہ لال کنویں پر ہمدرد کے سامنے آئے تو وہاں ہمدرد کے کارکنوں نے گلاب کے منوں پھول ان پر برسادیے۔

قائداعظم جامع مسجد پر میدان میں تقریر کرتے تھے۔ میں وہاں ضرور جاتا

تھا۔ محترمہ فاطمہ جناح سے بھی میرا رابطہ رہتا تھا جو ان کے آخری سانس تک جاری رہا۔ نونہالو! وہ مزاج کی ذرا سخت تھیں۔ کیا مجال کوئی بے قاعدگی ہوجائے۔ مجھے اور میری بیٹی سعدیہ کو صرف اجازت تھی کہ جب چاہیں بغیر اطلاع کے آجائیں۔ ہم ان کو آنٹی کہا کرتے تھے۔ قائداعظم کے لیے میں ۱۰ اورنگ زیب روڈ پر ان کی پسندیدہ اسپغول کی بھوسی خود جاکر محترمہ مس جناح کو دیا کرتا تھا۔ وہاں تحریک پاکستان کے لوگ آتے تھے۔ ان کا جذبہ قابل قدر ہوتا تھا۔

۱۹۴۰ء میں جب لاہور میں پاکستان ریزولیوشن پیش ہوا تو میں بھی منٹو پارک میں موجود تھا۔ میں نے اپنے دوست جناب محترم ایم اسلم کے ہاں بارود خانے میں قیام کیا تھا۔ اس زمانے میں مسلم لیگ کے رہنما اور حضرت علامہ اقبال کے سمدھی جناب میاں امیرالدین بھی بارود خانے میں رہتے تھے۔ ان ہی دنوں مشہور ادیب حکیم احمد شجاع صاحب سے میری ملاقات ہوتی تھی۔

میاں ایم اسلم ناول نگار کی حیثیت سے بلند رتبہ رکھتے تھے۔ میری ان سے بڑی گاڑھی چھنتی تھی۔ میں لاہور میں ہر سال ان کی برتھ ڈے منایا کرتا تھا!

تحریک پاکستان کے سلسلے ہی میں مجھے دہلی میں حضرت مولانا جمال میاں فرنگی محلی کی تقریریں سننے کا موقع ملا۔ ان دنوں وہ نوجوان تھے۔ میں نے دیکھا کہ مولانا شوکت علیؒ ان کی بہت داد دیتے تھے۔ اب مولانا جمال میاں بزرگ ہیں۔ مجھے فخر ہے کہ ہم دونوں دوست ہیں۔

تحریک پاکستان کے سلسلے میں راجہ صاحب محمود آباد سے تعلق قائم ہوا۔ ایک بار وہ میونسپلٹی پارک دہلی میں مسلم لیگ کے ایک جلسے میں آئے۔ میں بھی وہاں تھا۔ وہ تیزی سے آئے اور اسٹیج کے نیچے جوتیوں میں بیٹھ گئے۔ لاکھ کہا کہ اوپر آیئے۔ مولانا شوکت علی اٹھ کر آئے، مگر راجہ صاحب اوپر اسٹیج پر نہ گئے۔ بعد میں تقریر کرنے اوپر ضرور گئے۔ نونہالو! ہماری یہ بڑی باوقار شخصیت ہیں۔ انھوں نے مسلم لیگ اور تحریک پاکستان کے لیے اپنا سب کچھ قربان کردیا۔ راجہ صاحب محمود آباد عظیم انسان تھے۔ مجھے سعید بھائی کہا کرتے تھے۔ آخری زندگی بھی سادگی میں بسر ہوئی۔ اپنا ناشتہ کھانا خود ہی پکاتے تھے۔ لندن میں ان کے ساتھ میں ناشتہ کرتا تھا۔

ایک بار پاکستان کے صدر جنرل محمد یحییٰ خاں سے میں نے کہا: جناب جس کرسی صدارت پر آپ ہیں وہاں راجہ صاحب محمود آباد کو ہونا چاہیے تھا۔ جنرل یحییٰ نے برا نہ منایا۔ پورے احترام کے ساتھ راجہ صاحب کو لندن سے بلایا۔ ان کو وزارت دینی چاہی، راجہ صاحب نے ہر وزارت قبول کرنے سے انکار کردیا۔ لندن جاکر سادگی سے اپنے حجرے میں رہتے رہے۔ اسی تنگ حجرے میں بیٹھ کر انھوں نے منصوبہ بندی کی اور لندن میں دنیا کا ایک بڑا اسلامی مرکز تعمیر کرادیا!

نونہالو! میں نے عملی سیاست میں حصہ نہیں لیا۔ ہمیشہ اس سے بچا رہا۔ مگر پاکستان تو میں پاکستان کی محبت میں آیا تھا۔ دہلی میں میرے پاس بہت کچھ تھا۔ اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ کروڑوں کے اثاثے چھوڑ کر خالی ہاتھ

پاکستان آیا تھا۔ میں نے اسلامی ملک کی تعمیر میں حصہ لینا چاہا تھا۔ یہی جذبہ یہاں لایا تھا۔ پھر میں نے جتنا مقدور تھا پاکستان کی خدمت کی ہے۔

نونہالو ! صدر پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں میرے ذاتی دوست تھے۔ وہ مجھ پر بڑا کرم فرماتے تھے۔ اس قدر کرم کہ جب افغانستان کے شاہ امان اللہ پاکستان آئے تو ان کے ساتھ ایک فوٹو خاص طور پر کھنچوایا۔ اس میں شاہ امان اللہ' ان کی ملکہ' صدر ایوب خاں اور ان کی بیٹی بیگم پرنس جہاں زیب' حکیم محمد سعید اور سعدیہ سعید ہیں۔

ایک بار صدر ایوب خاں نے سیٹھ داؤد کو ہدایت دی کہ حکیم صاحب کو الیکشن میں کھڑا کرنا ہے۔ میں ان کو وزیر بنانا چاہتا ہوں۔ سیٹھ داؤد میرے پاس آئے حکم سنایا۔ میں نے ان کو نہایت احترام سے روانہ کردیا ور خود میں نے جناب صدر فیلڈ مارشل ایوب خاں سے کہا کہ جناب والا! وزارت وغیرہ میرے مزاج کے خلاف ہے۔ میں ٹکٹ واپس کرنے آیا ہوں۔ ہاں حکم ہے تو تعمیل کروں گا۔

فیلڈ مارشل کو دلی خوشی ہوئی ۔ فرمایا : "میرے پاس رات دن لوگ ٹکٹ لینے کے لیے آتے ہیں۔ پاکستان میں ایک تو بڑا آدمی ہے جو وزارت واپس کرنے آیا ہے !"

ہمدرد کا نام

نونہالوں نے سوال کیا ہے کہ "ہمدرد" نام کس نے تجویز کیا ہے اور

کب اور کہاں؟

بہت خوب سوال کیا ہے۔ ہمدرد دو لفظوں سے بنا ہے۔ "ہم" اور "درد"۔ "ہم" کے معنی ہیں ساتھ، شریک جیسے "ہم جماعت" جماعت میں شریک، تو ہم درد کا مطلب ہوا درد میں شریک! "ہمدرد" دوسروں کے درد میں شریک ہونے والا، دوسروں کے درد میں ساتھ دینے والا۔

نونہالو! تم نے دیکھا کہ ہمدرد کتنا پیارا لفظ ہے! سچ تو یہ ہے کہ انسانی تہذیب کا اور انسانی معاشرے کا اور تاریخ کا یہ لفظ "ہمدرد" ایک بڑا ہی باوقار لفظ ہے۔

یہ نام میرے والد محترم جناب حکیم حافظ عبدالمجید صاحب نے ۱۹۰۶ء میں رکھا تھا۔ وہ دہلی آچکے تھے۔ ابتدائی دور میں ان کو روزگار کی تلاش تھی۔ وہ جیکب آباد شکار پور میں بھی رہے۔ مگر وہ ایسا ذریعہ معاش چاہتے تھے جس میں خدمت ساتھ ساتھ ہو۔ انھوں نے کپڑے کا کار بار بھی کیا، مگر ان کو اطمینان نہ ہوا۔ انھوں نے طب کا مطالعہ کیا تھا۔ خاص طور پر نباتات، جڑی بوٹیوں سے ان کو گہرا لگاؤ تھا۔

نونہالو! دہلی میں ایک خاندان شریفی بھی بڑا مشہور ہوا ہے۔ حکیم حافظ محمد اجمل خان اسی خاندان شریفی کے فرزند ارجمند تھے جو اپنے عروج پر پہنچے تو ہندستان کے بڑوں میں شمار ہوئے۔ طب کی انھوں نے لازوال خدمت کی۔ طبیہ کالج قائم کیا۔ گاندھی جی اور وائسرائے ہند کو اس میں شریک کیا۔ میں نے انھی کے قائم کردہ طبیہ کالج میں پڑھا ہے۔

میرے والد جناب مسیح الملک حکیم حافظ محمد اجمل خاں کے شریک

کار رہے۔ مگر ایک واقعہ ایسا پیش آیا کہ میرے والد پر عدم اعتماد کا شبہ ہوا۔ میرے والد جناب حکیم عبدالمجید نے ایک منٹ میں علاحدگی اختیار کرلی، اور پھر انھوں نے اپنا دواخانہ قائم کرلیا۔ نام رکھا: ہمدرد ! جناب حکیم حافظ محمد اجمل خاں کو اپنے ایک رفیق کی علاحدگی کا رنج تھا۔ وہ گاہے گاہے ہمدرد میں آیا کرتے تھے اور نباتات حاصل کرتے تھے۔ میرے والد محترم کو نباتات کے میدان میں برتری حاصل تھی۔

نونہالو! وہ فرمایا کرتے تھے کہ انسان کے امراض کا علاج نباتات سے کرنا ہی صحیح ہے۔ یہ فطری اور قدرتی علاج ہے۔ وہ کہتے تھے کہ انسان کو ہمیشہ نباتات کو اپنانا ہوگا۔ ان کی رائے صحیح تھی۔ انھوں نے تو ۱۹۰۶ء میں یہ بات کہی تھی۔ آج ۱۹۹۲ء ہے۔ آج ساری دنیا نباتات کی بات کرتی ہے اور نباتات سے علاج کو صحیح تر قرار دیتی ہے۔

نونہالو ! تم جانتے ہو، اور نہیں جانتے تو جان لو کہ نام کا اثر کردار پر پڑتا ہے۔ اگر تمھارا نام محمد شریف ہے تو تم اپنے نام کی لاج رکھنے کے لیے شرافت کو اپناؤ گے۔ اگر تمھارا نام بہادر خان ہے تو تم ضرور بہادر بنو گے۔ اسی طرح ہمدرد کے معنی کسی کے درد میں شریک ہونا ہے تو ضرور ہمدرد، ہمدرد ہی ہوگا اور خدمت اس کی شان و شعار ہوگا۔ تم جانتے ہو اور دیکھتے ہو کہ ہمدرد کے تمام کام خدمت کے کام ہیں۔

شام ہمدرد

نونہالو! شام ہمدرد بڑوں اور بزرگوں کی مجلس ہے۔ غور و فکر کرنے والے اور سوچنے والے حضرات اور خواتین ہر مہینے کئی شہروں میں ایک

مقررہ تاریخ پر سر جوڑ کر بیٹھتے ہیں اور پاکستان اور پاکستان میں رہنے والے بڑوں، نوجوانوں اور نونہالوں کی اچھائی اور ان کی صلاح و فلاح کے لیے غور کرتے ہیں۔ شام ہمدرد کے بزرگ حکومت کے لیے راہیں تجویز کرتے ہیں تاکہ وہ غور کرے اور اچھائیوں کو اختیار کرے۔

نونہالو! سوچنا، غور کرنا، گہرائیوں میں جاکر راستے تلاش کرنا، دنیا کے لوگوں کے تجربات اور مشاہدات سے فائدہ اٹھاکر اپنے لیے اچھائیوں کا سامان کرنا سب سے بڑی خدمت ہے۔ شام ہمدرد کے بزرگ یہی کام کرتے ہیں۔ ابھی چند ہی ماہ پہلے کی بات ہے وسط ایشیا (سنٹرل ایشیا) کے بارے میں شام ہمدرد میں غور ہوا۔ پشاور میں بزرگ جمع ہوئے اور اسلام آباد میں بھی، لاہور میں بھی بزرگ ایک جگہ ہوکر بیٹھے اور پھر کراچی میں بھی۔ ان سب بزرگوں نے ایک راستہ چنا اور اس راستے پر چلنے کے لیے صاف صاف باتیں کیں، تجویزیں پیش کیں۔ اب ہم نے دیکھا کہ دیانت دار حکومت نے شام ہمدرد کی تمام تجاویز کو سامنے رکھ کر تعمیر و تدبیر کا ایک جامع منصوبہ تیار کیا ہے اور آج کل اسی پر عمل درآمد ہورہا ہے۔

نونہالو! میں نے دیانت دار حکومت اس لیے کہا کہ ہر حکومت سمجھدار نہیں ہوتی۔ ایسے حاکم بھی ہوتے ہیں جو اپنے ہی اہل دل اور اپنے ہی صاحبان فکر و قلم اور اپنے ہی بزرگوں کو خاطر میں نہیں لاتے بلکہ ان کا دماغ جو سوچتا ہے فقط اس پر عمل کرتے ہیں۔ ایسے حاکم دیانت دار نہیں ہوتے۔ دیانت یہ ہے کہ ملک کے اہل بصیرت کی فکر و

نظر سے فائدہ اٹھایا جائے اور ان کا احترام کیا جائے۔ موجودہ حکومت اس اعتبار سے دیانت دار ہے کہ کم از کم اپنے اہل دانش کی بات پر غور کرتی ہے۔ اور دیانت داری کی معراج یہ ہے کہ تعمیر وطن کے لیے جو تجاویز جہاں سے آئیں ان کا اعتراف کیا جائے اور صاحبان فکر کو احترام دیا جائے۔ موجودہ حکومت کو اس معراج کو چھونا چاہیے۔

نونہالو! میں نے تم کو شام ہمدرد کے بارے میں بتادیا ہے کہ یہ کیا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ ہزارہا بزرگ شام ہمدرد میں شریک ہوکر ملک اور ملت کے لیے راہ فکر و عمل دکھا چکے ہیں۔ اگر تم دیکھو تو ہزاروں مقالات تیار ہوئے ہیں۔ ہزارہا تجاویز تیار ہوئی ہیں اور ہاں نونہالو ! "شام ہمدرد" پاکستان کی واحد تنظیم ہے کہ جو گزشتہ کوئی ۳۵ سال سے جاری ہے۔ کبھی بند نہیں ہوئی۔ مثلاً لاہور میں ۳۵ سال سے ہر انگریزی مہینے کی پہلی جمعرات کو منعقد ہوتی ہے۔ اس پروگرام میں آج تک فرق نہیں آیا۔ کیوں ہے نا بڑی بات ہے !

اس شام ہمدرد سے لوگوں نے رشک زیادہ کیا ہے۔ رشک کرنا اچھی بات ہے۔ اس سے کام کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ حسد کرنا سخت برا ہے۔ مگر شام ہمدرد سے بعض لوگوں نے حسد بھی کیا ہے۔ مثلاً ایک گوہر آب دار' دور ایوبی میں چمکا۔ اس نے ایوب خاں کو یہ باور کرادیا کہ حکیم سعید! اس طرح سیاست میں آنا چاہتے ہیں۔ یہ شام ہمدرد ایوب خاں کے خلاف جاسکتی ہے۔ ان بے چارے سکرٹری کو معلوم نہ تھا کہ میں ٹکٹ واپس کرچکا ہوں اور وزارت قبول کرنے سے انکار کرچکا

ہوں۔ صدر ایوب نے ان کو خاموش کردیا، مگر ان بزرگ کے الطاف کریمانہ جاری رہے اور شام ہمدرد کے مقابلے میں ایک پلیٹ فارم انھوں نے بنایا جس نے چند ماہ میں دم توڑ دیا۔

ہاں ایک تھنکرز فورم بھی بنا۔ نہایت اچھے انسان چوہدری ظہور الٰہی صاحب بعض لوگوں کے کہنے میں آگئے۔ انھوں نے فورم کے جلسے لاہور میں شروع کردیے۔ پھر مجھ پر دباؤ ڈالا گیا کہ شام ہمدرد کو "تھنکرز فورم" میں ضم کردیں (ملادیں)۔ یہ ایک سازش تھی کہ شام ہمدرد کو کم زور کردیا جائے۔ نونہالو! دکھ یہ ہے کہ اس سازش میں میرے ایک نہایت عزیز دوست درپردہ شریک تھے۔ ایسے دوست جن کی میں نے ان کے عالم غربت میں دل کھول کر مدد کی۔ اب وہ کروڑ پتی ہیں۔

نونہالو! شروع شروع میں اس تنظیم کا عنوان تھا: ایک شام ایک سائنس داں کے ساتھ، ایک شام ادیب و شاعر کے ساتھ، وغیرہ، پھر ایک شام لاہور میں غور ہوا کہ اس تنظیم کا نام کیا رکھا جائے۔ اس غور فکر میں نونہالو! بہت پیارے لوگ شریک ہوگئے مثلاً جناب محترم جسٹس ایس۔اے۔رحمان۔ یہ پاکستان کے چیف جسٹس تھے۔ نہایت عظیم انسان۔ نہایت عظیم قانون دان، نہایت بلندپایہ عالم، نہایت رفیع انسان، جناب میاں ایم۔ اے۔ اسلم، تم کو ضرور جاننا چاہیے کہ میاں ایم۔اسلم بڑے اچھے ناول نگار تھے۔ بہت اچھے پیارے انسان تھے۔ جناب مولانا کوثر نیازی، تم ان کو ضرور جانتے ہوگے۔ اچھے عالم، گہرے سیاست داں، خوب شاعر اور ادیب، جناب پروفیسر حمید احمد خان جو بعد

میں پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے۔ بہت بڑے ماہر تعلیم' عالم فاضل' جناب محمد یوسف کھوریا' میرے بڑے دوست تھے مگر بعد میں ناراض رہے۔ میٹنگ بھی ان کے گھر پر گارڈن ٹاؤن ۶ میں ہوئی تھی۔ جہاں تک مجھے یاد آتا ہے جناب کلیم عثمانی بھی تھے۔ بڑے پیارے شاعر۔ خیر' نونہالو! بہت سے نام زیر غور آئے۔ آخر کار "شام ہمدرد" نام تجویز ہوا اور سب نے اس سے اتفاق کرلیا۔ شام ہمدرد !

نونہالو! سب سے پہلی نشست کراچی میں ہوئی۔ مہمان مقرر تھے جناب محترم ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی' پاکستان کے بہت بڑے سائنس داں' دنیا ان کو بڑا سائنس داں سمجھتی ہے' اور وہ ہیں بھی۔ انگلستان کی رائل سوسائٹی نے ان کو اپنا فیلو بنایا۔ پاکستان نے ہلال امتیاز کا اعزاز دیا۔ جرمنی نے ان کو اعزازات دیے۔ ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی صاحب کو ہمدرد سے گہرا تعلق رہا ہے۔ وہ اب نوے سال سے زیادہ کے ہیں۔ گاہے گاہے اب بھی اپنی سائنس لیبورٹری میں جاتے ہیں۔

نونہالو ! شام ہمدرد سے پاکستان کی اہم ترین شخصیتوں نے خطاب کیا ہے۔ پاکستان کا یہ واحد فورم ہے جسے یہ وقار حاصل ہے کہ پاکستان کے صدر تک نے شام ہمدرد سے خطاب کیا ہے۔

بزم ہمدرد نونہال

مجھے معلوم تھا کہ میرے نونہال شام ہمدرد کے بعد فوراً ہی بزم

ہمدرد نونہال کی بات کریں گے! ہاں، میں جانتا ہوں کہ یہ سوال کرنے کا بھی میرے پیارے نونہالوں کو حق ہے۔ بڑا حق ہے۔ نونہالوں نے دو طرح بات کی ہے۔

بزم ہمدرد نونہال شروع کرنے کا خیال کیسے آیا ؟

بزم ہمدرد نونہال کا آغاز کب اور کہاں ہوا ؟

نونہالو! یہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ اپنے بچوں سے محبت کرتا ہے۔ اپنے بچوں سے انسان کی محبت کے بارے میں لوگوں نے طرح طرح کی موشگافیاں کی ہیں۔ اگر کوئی ماہر نفسیات ہے تو اس محبت کی اس نے اپنے انداز سے تعبیر کی ہے۔ کوئی ماہر جنسیات ہے جیسا کہ سگمنڈ فرائڈ تو اس نے گندے طور پر بات کی ہے۔ ادیب اور شاعر نے بھی شاعری سے کام لیا ہے۔ مگر سچی بات یہ ہے کہ ہر انسان اپنی اولاد کو اپنا سمجھتا ہے۔ اپنا ایک حصہ سمجھتا ہے۔ جس طرح انسان کو پھول خوبصورت نظر آتے ہیں اور وہ ان کے رنگ رنگ کی تعریف کرتا ہے اور پھولوں کی خوش بو سے سرشار ہوتا ہے بالکل اسی طرح انسان اللہ تعالیٰ کے عطیے نونہالوں سے محبت کرتا ہے۔

ہر انسان اپنی اولاد سے محبت کرتا ہے ان کی بھلائی کے لیے رات دن کوشاں رہتا ہے۔

مگر نونہالو! محبت جب اپنی بلندیوں کو چھوتی ہے تو پھر اس کے جلوے بھی ایک شان رکھتے ہیں۔ نونہالوں سے محبت جب بے کراں ہوتی ہے تو اس کی شان یہ ہوتی ہے کہ انسان کو ہر بچے سے محبت

ہو جاتی ہے۔ ایسے بلند انسان کو پھر ہر بچہ اپنا بچہ نظر آنے لگتا ہے۔ یہ محبت کی عظمت ہے۔

نونہالو! میں بھی انسان ہوں۔ میری بھی اولاد ہے۔ میری اولاد کی بھی اولاد ہے۔ جب تک میں اپنی اولاد سے محبت کرتا رہا مجھے بزم ہمدرد نونہال کا خیال نہیں آیا۔ اس کے باوجود میں نے ۴۰ سال پہلے کی بات ہے پاکستان کے نونہالوں کی تعلیم و تربیت اور صحت کے لیے ماہانہ رسالہ "ہمدرد نونہال" جاری کیا تھا۔ ۴۰ سال سے یہ رسالہ بڑی محبت سے میں نکال رہا ہوں اور پاکستان کے بچے اپنے اس رسالے سے بڑی محبت کرتے ہیں۔

نونہالو! بات میں بات پیدا ہوتی ہے۔ جب رسالہ ہمدرد نونہال نکالنے کا خیال آیا تو میں نے اس وقت کے بہت سے دوستوں سے مشورہ کیا تھا۔ ان میں پاکستان کے بہت بڑے انسان ڈاکٹر محمود حسین صاحب جو وزیر تعلیم بھی رہے اور کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہے' ان سے مشورہ کیا۔ ڈاکٹر محمود حسین صاحب کا ایک کارنامہ جامعہ ملیہ قائم کرنا ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خان کے چھوٹے بھائی تھے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خان نے دہلی میں جامعہ ملیہ اسلامیہ قائم کی تھی۔ پھر وہ ہندستان کے صدر بھی بنے۔ خیر ہمدرد نونہال کے لیے میں پاکستان کے مشہور ماہر تعلیم ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب کے پاس بھی گیا تھا اور ان سے بھی مشورہ کیا تھا۔ ایک اور نہایت عجیب انسان تھے۔ جناب ممتاز حسن' یہ وہی ممتاز حسن ہیں جن کی کوششوں سے نیشنل میوزیم اوف پاکستان

قائم ہوا۔ نونہالو ! کہنے کو تو جناب ممتاز حسن سرکاری ملازم تھے یعنی بیوروکریٹ تھے' مگر نونہالو! ہر بیوروکریٹ ظالم نہیں ہوتا۔ بیوروکریٹ انسان بھی ہوتا ہے۔ ممتاز حسن صاحب انسان تھے۔ وزارت مالیات کے سکرٹری تھے۔ اپنا سرکاری کام بھی خوب کیا۔ مگر ساتھ ہی علم و ادب اور ثقافت کی لازوال خدمت کر گئے۔ اگر پاکستان میں سارے بیوروکریٹ ممتاز حسن جیسے ہو جائیں تو پاکستان میں خوش گوار انقلاب آجائے۔ اللہ تعالیٰ پاکستان کے بیوروکریٹوں کو ممتاز حسن بننے کی توفیق دے۔ آمین !

ہاں بھئی نونہالو! بات یہ ہو رہی تھی کہ بزم ہمدرد نونہال قائم کرنے کا خیال کیسے آیا؟ میں محبت کی بات کر رہا تھا کہ ایک فطری محبت تو یہ ہوتی ہے کہ انسان اپنی اولاد سے محبت کرتا ہے۔ مگر جب یہ محبت بے کراں اور بے حساب ہو جاتی ہے تو اسے پھیلنے کے لیے دنیا چاہیے ہوتی ہے۔ جب محبت اس مرتبے پر آجاتی ہے تو پھر انسان کو دنیا کا ہر بچہ اپنا بچہ نظر آتا ہے۔ وہ پھر انسان' انسانیت کی مرتبے پر اس قدر بلندی پر چلا جاتا ہے کہ اسے ہر بچہ اپنا بچہ محسوس ہوتا ہے اور وہ ہر بچے سے محبت کرتا ہے۔

سبحان اللہ' ایسے انسان وہ ہوتے ہیں جن پر اللہ تعالیٰ بھی مہربان ہو جاتا ہے۔ ان سے اللہ تعالیٰ بھی محبت کرنے لگتا ہے۔

نونہالو! جب میں نے اپنی محبت کو اس قدر بڑھالیا کہ مجھے پاکستان کا ہر بچہ اور دنیا کا ہر بچہ اپنا بچہ لگا تو پھر مجھے بزم ہم درد نونہال شروع کرنے کا خیال آیا۔ میں جس طرح اپنی اولاد کی بھلائی کی سوچتا ہوں اسی

طرح میں ہر بچے کی بھلائی کی سوچتا ہوں!

تم نے دیکھا کہ جنوری ۱۹۹۲ء میں روس کے بچے پاکستان آئے تھے۔ یہ کیا جذبہ تھا؟ جذبہ صادق تھا! روس کے بچے بھی مجھے اپنے بچے محسوس ہوئے!

تو جناب ایک سوال کا جواب تو میں نے دے دیا۔ اب دوسرے سوال کا جواب دیتا ہوں۔

ہمدرد کے زیرِ اہتمام بچوں کے پروگرام کوئی نئی بات نہیں ہے۔ صحت کے موضوع پر سال ہا سال نونہالوں اور نوجوانوں کے پروگرام ہوئے ہیں۔ یہ ۱۹۸۷ء کی بات ہے کہ عالی جناب محترم جنرل محمد ضیاء الحق مدینتہ الحکمت تشریف لائے۔ وہ ہمدرد پبلک اسکول کا سنگ بنیاد رکھنے تشریف لائے تھے۔ یہ بھی بڑی شان دار تقریب تھی۔ اس میں آٹھ ہزار بچوں نے شرکت کی تھی۔ جناب صدر ضیاء الحق سخت حیران تھے کہ اتنے بچے جمع کیسے ہوئے۔ میں نے کہا : میری محبت ان کو کھینچ لائی ہے!

اس جلسے میں بہت سی تقریریں نونہالوں کی تھیں۔ موضوع تھا : "تعلیم ہمارا حق ہے!" دراصل آغاز بزم ہمدرد نونہال کا یہ ہے۔ پھر آج سے کوئی چھے سال پہلے یہ خیال آیا کہ جس طرح بڑوں کی شام ہمدرد ہوتی ہے اسی طرح بچوں کی بھی شام ہمدرد ہونی ہی چاہیے۔ جناب مسعود احمد برکاتی صاحب سے مشورہ ہوا۔ دوسرے لوگ بھی شریک ہوئے یعنی جناب تصویر حسین حمیدی، جناب علی حسن صاحب

وغیرہ۔ بس میں تو تیار ہی تھا۔ ہمدرد فاؤنڈیشن نے یہ فیصلہ کیا کہ اخراجات فاؤنڈیشن دے گا۔ "بزم ہمدرد نونہال" نام طے پایا۔ کراچی کے بعد پشاور، راولپنڈی اور لاہور میں بھی بزم کے جلسے ہر مہینے شروع ہوگئے۔ میرا دل تو باغ باغ ہوگیا۔ جب نونہالوں نے اپنی بزم سے والہانہ دل چسپی لی تو میرا دل بے حد مطمئن ہوا اور خوش ہوا۔ پھر پاکستان کے بہت سے اسکولوں نے بھی بزم ہمدرد نونہال سے دل چسپی لی۔ سیکڑوں اسکولوں کے اساتذہ کرام نے بہترین تعاون کیا ہے اور کرتے ہیں۔

نونہالو! محبت اور خلوص دو نہایت مقدس جذبات ہیں۔ بزم ہمدرد نونہال میں محبت اور خلوص دونوں جذبے موجود ہیں۔ ان کی وجہ سے تعمیر کے راستے کھلتے چلے جاتے ہیں۔ بزم ہمدرد نونہال اب پاکستان میں سب سے پہلا نونہالوں کا پلیٹ فارم تو تسلیم کیا جاتا ہی ہے، مگر اب اسے ایک تعلیمی اور اصلاحی پروگرام کی حیثیت سے بھی مانا جاتا ہے۔

اور تو اور بزم ہمدرد نونہال کی وجہ سے میں بھی اچھا خاصا نونہال بن گیا ہوں۔

صحافت اور ادب

میں نے تمھیں بتایا تھا کہ میں صحافی بننا چاہتا تھا، مگر طب خاندانی فن تھا اور فن شریف، اس لیے طب پڑھی، لیکن میں نے اپنا ذاتی شوق بھی پورا کیا اور لکھنا شروع کردیا۔ کم عمری ہی میں ایک افسانہ لکھ ڈالا۔ اس

افسانے کا عنوان تھا "تسبیح"۔ افسانہ تو چھپ گیا، مگر تسبیح ہمیشہ کے لیے ہاتھ میں آ گئی!

پھر بھائی جان محترم نے بھی میرے رجحان کو دیکھ کر میری ہمت افزائی کی اور مجھے ہمدرد صحت کی ترتیب کے کام میں شامل کر لیا۔ پہلے پروف ریڈنگ کرائی۔ بھائی جان نے ۱۹۳۲ء میں ہمدرد صحت جاری کیا تھا اور وہ خود اس کے مدیر تھے۔ میری پروف ریڈنگ ابتدا تھی ایڈیٹری کی۔ طبیہ کالج سے ۱۹۳۹ء میں، میں فارغ ہوا تو انھوں نے ہمدرد صحت کی ایڈیٹری میرے سپرد کر دی۔ ۱۹۴۰ء میں میں نے ہمدرد صحت کا پہلا شمارہ ایڈٹ کیا۔ اس طرح مجھے طب کے علمی مطالعے کا خوب موقع ملا اور میں نے اس سے خوب فائدہ اٹھایا۔ طبی لٹریچر خوب پڑھا۔ طب قدیم (یونانی) کے علاوہ جدید طب (ایلوپیتھی) پر بھی مضامین اور کتابیں پڑھنی پڑیں۔ میں نے ہمدرد صحت کے کئی موٹے موٹے خاص نمبر بھی نکالے۔ روحانی علاج نمبر، عورت نمبر وغیرہ خوب مقبول ہوئے۔ جب سے اب تک میں ہمدرد صحت ایڈٹ کرتا ہوں۔ میری دل چسپی کم نہیں ہوئی ہے۔ پچاس سال ہو گئے ہیں۔

ہمدرد نونہال جاری کرنے کا مختصر حال میں تم کو سنا چکا ہوں۔ ۱۹۵۳ء سے بچوں کا یعنی تمھارا یہ رسالہ پابندی اور باقاعدگی سے جاری ہے۔ ۴۰ سال میں اب تک اس رسالے کا ایک شمارہ بھی نہ ناغہ ہوا اور نہ تاخیر سے شائع ہوا۔ اب یہ پاکستان کا بلکہ اردو کا نونہالوں کا سب سے بڑا، سب سے مقبول رسالہ ہے۔ ہمدرد نونہال نے اردو کی جو خدمت کی ہے

وہ تمام دانش ور مانتے ہیں۔ اس کی ایک خدمت یہ بھی ہے کہ اس کی وجہ سے اب نونہالوں کے لیے بہت سے رسالے نکلنے لگے ہیں اور ان کو نکالنے والے اکثر وہ ادیب اور صحافی ہیں جنھوں نے بچپن میں ہمدرد نونہال پڑھ کر فائدہ اٹھایا اور ان کو خود بھی لکھنے کا شوق ہوا۔

ان دونوں رسالوں کے علاوہ میں نے کئی اور رسالے بھی جاری کیے۔ ہمدرد صحت کا گجراتی اور فارسی ایڈیشن بھی نکالا۔ اطبا کے لیے اخبار الطب' انگریزی میں مڈیکل ٹائمز' ہمدرد مڈیکل ڈائجسٹ' ہمدرد مڈیکس نکالے اور اب بھی نکالتا ہوں۔ انگریزی میں ایک رسالہ ہمدرد اسلامیکس بھی نکالتا ہوں۔ یہ اسلامی رسالہ ہے اور اس میں انگریزی دانوں اور بیرونی ملکوں کے لیے دینی مضامین ہوتے ہیں۔

رسالوں کے ساتھ مجھے کتابیں لکھنے کا بھی شوق ہوا۔ میری اب تک کوئی ۷۵ کتابیں تو شائع ہوچکی ہے۔ صحیح تعداد تو مجھے بھی یاد نہیں۔ یہ کتابیں اردو کے علاوہ انگریزی میں بھی ہیں۔ طب اور صحت کے علاوہ اسلام پر' تاریخ پر بھی میں نے کتابیں لکھی ہیں۔

نونہالو ! تمھارے لیے بھی میں نے کتابیں لکھی ہیں۔ ۱۲ سفرنامے تو صرف تمھارے لیے لکھے ہیں۔ میں سفر بہت کرتا ہوں اور ملکوں ملکوں گھومتا ہوں۔ پہلے تو میں نے بڑوں کے لیے سفرنامے لکھے' جن کی تعداد دس ہوگئی ہے' لیکن پچھلے چند سال سے میں نونہالو ! صرف تمھارے لیے سفرنامے لکھ رہا ہوں۔

نونہالوں کے لیے اردو میں پہلے ایک بھی سفرنامہ نہیں تھا۔ ہمدرد

نے اس کی ابتدا کی۔ اردو میں نونہالوں کے لیے سفرنامہ میرا اور میرے رفیق مسعود احمد برکاتی کا ہے۔ یہ انگلستان اور فرانس کا سفرنامہ ہے۔ اس طرح اب تک اردو کو نونہالوں کے بارہ سفرنامے مل گئے۔ اب اس سال (۱۹۹۲ء میں) میں ڈائری لکھ رہا ہوں۔ روزانہ جو کچھ کرتا ہوں، جو کچھ پڑھتا ہوں اور جو کچھ سوچتا ہوں وہ لکھ دیتا ہوں اور ایک مہینہ پورا ہونے کے بعد ایک کتاب چھاپ دیتا ہوں۔ اس سال کے دس مہینوں کی ڈائری لکھ چکا ہوں۔ اس ڈائری کا نام میں نے سچی کہانی رکھا ہے۔

نونہالو! تمھارے لیے میں نے دینی کتابیں بھی لکھی ہیں۔ "نقوش سیرت" کے نام سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک زندگی کے سبق آموز واقعات پانچ حصوں میں لکھے ہیں۔ حضورؐ کی احادیث بھی تمھارے لیے جمع کی ہیں۔ چالیس چالیس حدیثوں کی ایک ایک کتاب بنائی ہے۔ یہ چھوٹی چھوٹی اور خوب صورت کتابیں "خوب سیرت" کے نام سے شائع ہو رہی ہیں۔

میں نے دوسرے لکھنے والوں کو بھی بچوں کے لیے لکھنے کا شوق دلایا ہے اور ان سے کتابیں لکھوائی ہیں۔ ان کو شائع کرنے کے لیے ایک شعبہ قائم کر دیا ہے۔ اس کا نام ہے "نونہال ادب"۔ اس شعبے نے اب تک دو سو کتابیں شائع کی ہیں۔

تمھارے لیے ایک دل چسپ اور رنگین اخبار بھی "نونہال اخبار" کے نام سے جاری کیا ہے۔

سفر

اب ذرا سفروں کا ذکر بھی کردوں۔ عربی میں تو سفر کی جمع "اسفار" ہے، لیکن میں نے تو اردو ہی لکھ دی ہے۔ مجھے بچپن میں سفر کا شوق بھائی جان محترم کو پہلی بار ہوائی جہاز سے الہ آباد روانہ ہوتے دیکھ کر پیدا ہوا تھا۔ اس وقت میں بہت رنجیدہ ہوا تھا کہ میں ہوائی جہاز میں کیوں نہیں جارہا ہوں۔ خیر وہ تو بچپن تھا، ہندستان کے چند شہروں کے سفر کیے اور پاکستان آنے کے بعد میں سب سے پہلے ملک سے باہر ۱۹۴۸ء میں گیا۔ یہ مصر کا سفر تھا۔ حکومت پاکستان کی طرف سے ایک طبی وفد کے ساتھ عالمی ادارۂ صحت میں شامل ہوکر گیا تھا۔ دوسرا سفر ۱۹۵۰ء میں روم کا تھا۔ یہ بھی عالمی ادارۂ صحت کے لیے تھا۔ پھر ۱۹۵۶ء میں، میں اور بھائی جان یورپ کے کئی ملک دیکھنے گئے۔ مقصد سیروسیاحت کے علاوہ ان ملکوں کے طبی اداروں اور کتب خانوں کو دیکھنا اور سمجھنا تھا۔ ترکی، جرمنی، یوگوسلاویہ وغیرہ ہم دونوں بھائیوں نے دیکھے۔ یہ کوئی پونے تین مہینے کا سفر تھا۔ میرا پہلا سفرنامہ "یورپ نامہ" اور دوسرا "جرمنی نامہ" اسی سفر کی داستان ہے۔

نونہالو! بس جب سے میرے پیر چکر ہی میں ہیں۔ ملکوں ملکوں جاتا ہوں۔ دنیا کے چار براعظموں کے بیسیوں ملک دیکھ ڈالے، مگر جب بھی گیا تفریح کے لیے نہیں کسی اچھے مقصد سے گیا۔ زیادہ تر طب اور علم اور ہمدرد کے لیے گیا۔ کانفرنسوں میں بلاوا آیا تو گیا۔ اچھے لوگوں، عالموں، دانش وروں سے ملا۔ اپنی طب کا چرچا کیا۔ وہاں کے لوگوں کو

طب کے فائدے اور جڑی بوٹیوں (نباتات) کے فائدے سمجھائے اور ان تک طب کا پیغام پہنچایا۔ پاکستان کی خدمت کی۔ اچھے لوگوں کو دوست بنایا۔ سفر کا یہی تو فائدہ ہے۔ نئی نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ ذہن کھلتا ہے۔ علم بڑھتا ہے۔ نئے نئے تجربات ہوتے ہیں۔ معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ ان ملکوں کے حالات' وہاں کے لوگوں کی زندگی اور عادتیں معلوم ہوتی ہیں۔ ان کی ترقی کا راز سمجھ میں آتا ہے۔ میں نے سفر میں کبھی آرام نہیں کیا' کام کیا اور وقت کو پوری طرح استعمال کیا۔ تھوڑے وقت میں بہت کچھ دیکھا اور سمجھا اور اس سے اپنی قوم کو آگاہ کیا اور ان کی خدمت کی اور علم کی روشنی پھیلائی۔ سفر کرنے سے مجھ میں اعتماد پیدا ہوا۔ اپنی صلاحیتوں کا احساس ہوا اور یہ بات بھی سمجھ میں آئی کہ ہماری قوم بھی بڑی صلاحیتوں کی مالک ہے۔ اگر ہمارے لیڈر اور حکمراں صحیح کام کریں تو ہماری قوم دنیا میں کسی سے پیچھے نہیں ہے۔

تقریر

اچھا بھئی! ایک اور دل چسپ بات بتاؤں۔ یہ تمھارے لیے سبق آموز ہوگی۔ میں بچپن میں شریر تو تھا' لیکن شرمیلا بھی تھا۔ نئے آدمیوں کے سامنے جھجکتا تھا۔ زیادہ باتیں نہیں کرتا تھا۔ کم گو تھا اور تقریر کرنا؟ تقریر کرنا تو میرے بس میں بالکل نہیں تھا۔ زبان بھی رکتی تھی' لیکن مطالعے اور تحریر میں مشق اور عبور کے بعد تقریر بھی میری ضرورت

تھی۔ میں نے پڑھا تھا کہ دنیا کے بعض مشہور اور بڑے مقررین شروع میں اسٹیج پر کھڑے ہوکر بالکل نہیں بول سکتے تھے۔ زبان ہی نہیں کھلتی تھی، مگر انھوں نے اپنے ارادے اور مشق و محنت سے تقریر کرنے کا فن سیکھا اور اس میں خوب نام پیدا کیا۔ میں نے بھی یہی کیا۔ شروع شروع میں، میں صرف لکھ کر تقریر پڑھتا تھا، لیکن آہستہ آہستہ زبانی بولنا شروع کیا اور مشق بڑھتا رہا۔ اب اللہ کے فضل سے میں اسٹیج پر بلا تکلف بولتا ہوں اور لمبی لمبی تقریریں کرتا ہوں۔ بعض وقت تو بغیر تیاری کے بولنا پڑتا ہے اور مجھے دقت نہیں ہوتی۔ حاضرین کے معیار اور عنوان کے مطابق تقریر کرتا ہوں۔ اپنے شہر اور اپنے ملک ہی میں نہیں دوسرے ملکوں میں بھی مجھے تقریریں کرنی پڑتی ہیں۔ عالموں اور دانش وروں کے مجمع میں بھی بولنا پڑتا ہے۔ کانفرنسوں میں لکچر دیتا ہوں اور اعتماد سے اپنی بات کرتا ہوں۔

نونہالو! میں نے اس لیے یہ باتیں بتائی ہیں کہ تم بھی اس سے سبق حاصل کرو۔ کسی معاملے میں مایوس نہ ہو۔ کبھی نہ گھبراؤ۔ مشق اور ہمت سے کام لے کر اپنے جوہروں کو نمایاں کرو اور جس کام کو بھی شروع کرو اس کو انتہا تک پہنچا کر دم لو۔

مدینتہ الحکمتہ

نونہالو! مدینتہ الحکمتہ بڑا پیارا نام ہے۔ اس نام سے مجھے بڑی

محبت ہے۔ عربی زبان میں مدینہ کے معنی شہر کے ہیں۔ حکمت کے معنی دانائی اور عقل مندی ہیں۔ قرآن حکیم میں حکمت سائنس کے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے۔ حکمت بڑا جامع لفظ ہے۔ اس کا کوئی ایک ترجمہ مشکل ہے۔

نونہالو! یہ سنہ ۱۹۷۸ء کی بات ہے کہ دنیا کے ایک بہت بڑے انسان شاہ فیصل معظم نے مکتہ المکرمہ میں ایک عالمی تعلیم کانفرنس کا انتظام فرمایا تھا۔ اس کانفرس میں شرکت کی دعوت مجھے بھی ملی تھی۔ میرے ساتھ جناب محترم اے۔ کے۔ بروہی صاحب بھی تھے اور جناب ڈاکٹر منظور احمد بھی۔ مکتہ المکرمہ کی اس کانفرنس میں پاکستان سے بہت سے عالم گئے تھے۔ پشاور یونی ورسٹی کے وائس چانسلر جناب محترم ہاشم خاں، پنجاب یونی ورسٹی کے وائس چانسلر جناب ڈاکٹر خیرات ابن رسا وغیرہ۔ پھر دنیا بھر سے ماہرین تعلیم جمع ہوئے تھے۔ عرب اور عجم دونوں سے!

نونہالو! ڈاکٹر خیرات ابن رسا اور میں ایک ہی کمرے میں تھے۔ تمام دن ہم سب کانفرنس میں مصروف رہتے تھے۔ رات کو میں عشا کے وقت خانۂ کعبہ پہنچ جایا کرتا تھا۔ ساری رات وہاں رہتا تھا۔ طواف کرتا تھا۔ سعی کرتا تھا۔ تلاوت قرآن حکیم کرتا تھا۔ تہجد کی نماز حطیم میں ادا کرتا تھا۔ پھر فجر کی نماز ادا کرکے ہوٹل واپس آجاتا تھا۔ پانچ راتیں میں بالکل جاگتا رہا۔ دن بھر کام کرتا رہا۔ ڈاکٹر خیرات ابن رسا جو ان دنوں مراکش میں ہیں، سوال کرتے تھے: "حکیم صاحب! آپ سوتے

کب ہیں؟" میں کہتا تھا کہ انسان سونے کے لیے اس دنیا میں نہیں آیا ہے!

خیر نونہالو ! ایک رات میں طواف کر کے مقام ابراہیم پر بیٹھا تھا۔ مقام ابراہیم وہ جگہ ہے جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کھڑے ہو کر کعبہ کی تعمیر نو کرائی تھی۔ خیر میں یہاں بیٹھ کر غور کرتا تھا۔ سوچتا تھا۔ فکر کرتا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔

بس ایک رات تہجد کے وقت خیال آیا کہ مجھے تعلیم کے میدان میں کچھ کام کرنا چاہیے اور کوئی بڑا کام کرنا چاہیے۔ اس کے ساتھ "مدینتہ الحکمتہ" کا نام ذہن میں آیا۔ تائید ایزدی یہ تھی کہ ایک شہر علم کی بنیاد ڈالنی چاہیے۔ میں نے تہجد کی نماز ادا کی۔ اس کے بعد میں نے طواف کیا اور پھر غلاف کعبہ پکڑ کر کھڑا ہو گیا اور دعائیں مانگتا رہا کہ اللہ تعالیٰ مجھے سیدھا راستہ دکھا دیجیے۔ نونہالو' مدینتہ الحکمتہ نام اس طرح ذہن میں آیا! پھر میں مدینہ منورہ گیا۔ وہاں بھی دعائیں مانگتا رہا۔ اب تم نے سمجھ لیا کہ مدینتہ الحکمتہ کا آغاز کیسے ہوا! نہایت مبارک آغاز' الحمد للہ! اس کے بعد میں نے مقام ابراہیم میں بیٹھ کر ایک منصوبہ تیار کیا۔ بہت سی باتیں میرے ذہن میں ڈالی گئیں :

- نونہالوں کے لیے تعلیم کا مرکز - اسکول وغیرہ
- نوجوانوں کے لیے تعلیم کا مرکز - کالجز' یونی ورسٹی
- بڑوں کے لیے تعلیم - اعلا تعلیم کے مراکز
- اسلام کا ایک بڑا مرکز - دارالعلوم

- سائنس اور طب و صحت-اعلا مراکز
- عالمی اجتماعات کے لیے-اعلا مراکز
- ایک بیت العلما-شہر علما جہاں دنیا بھر کے عالم جمع ہوں
- ایک مرکز امن

نونہالو! مدینتہ الحکمتہ کے یہ معنی ہوئے۔ میں نے تم کو آغاز تو بتادیا۔ اب میں اس منصوبے کے مطابق رات دن کام کر رہا ہوں۔ اب تو یہ ایک شہر بن رہا ہے۔ انشاء اللہ ہزار ہا ایکڑ پر یہ شہر پھیل جائے گا۔ یہ صحرا جہاں میں نے کام شروع کیا' دس سال کے اندر اندر علم و حکمت کا سرسبز و شاداب شہر بن جائے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

نونہالو! مدینتہ الحکمتہ میں ایک بیت الحکمتہ بن گیا ہے۔ ابھی آدھا بنا ہے۔ آدھا تعمیر ہونا باقی ہے۔ یہ ایک بڑی لائبریری تو ہے' مگر یہ ایک تحقیق اور ریسرچ کا مرکز بھی ہے۔

نونہالو! بغداد میں خلیفہ ہارون الرشید کے بعد خلیفہ مامون الرشید نے ایک بیت الحکمتہ بنایا تھا۔ اسلامی دنیا کا یہ ایک بہت بڑا مرکز تحقیق و تعلیم تھا۔ میں نے اس کا حال پڑھا۔ بس میں یہ کوشش کر رہا ہوں کہ مدینتہ الحکمتہ کے بیت الحکمتہ کو میں بغداد کے بیت الحکمتہ جیسا تو بنا ہی دوں۔ مگر یہ اس سے بھی بڑا ہو سکتا ہے اور انشاء اللہ تعالیٰ ہوجائے گا۔ اللہ تعالیٰ سے نونہالو' تم بھی دعا مانگو۔ میں بھی رات دن دعائیں مانگتا رہتا ہوں! بیت الحکمتہ میں اس وقت تین لاکھ سے زیادہ کتابیں ہیں۔ ۲۵ لاکھ کتابیں مجھے جمع کرنی ہیں۔ یہاں اسلام'

سائنس اور تاریخ پر بہت اچھے شعبے ہیں۔ ہاں نونہالو، بیت الحکمتہ میں آج کوئی سترہ سو رسالے دنیا بھر سے آرہے ہیں۔

میرے نونہالو ! پاکستان میں علم و حکمت سے ذرا لگاؤ کم ہے۔ پاکستان کے دولت مند علم و حکمت پر اپنی دولت کم ہی خرچ کرتے ہیں۔ پھر پاکستان میں بیوروکریٹ بھی ایک طاقت ہے۔ اگر یہ طاقت نرم دل ہو تو علم و حکمت کے بڑے کام ہوسکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جب کرم فرمائیں گے تو سارے مراحل طے ہوجائیں گے۔ اب تک جس قدر کام ہوگیا ہے اس میں اللہ تعالیٰ کی مدد شامل حال ہے!

مدینتہ الحکمتہ میں ہمدرد پبلک اسکول بن گیا ہے۔ یہ پانچ ہزار نونہالوں کے لیے ہے۔ اب بڑی مشکل سے ہمدرد یونی ورسٹی کا اجازت نامہ (چارٹر) مل گیا ہے۔ اب ہم سب یونی ورسٹی کے لیے کام شروع کر رہے ہیں۔

نونہالو ! کراچی وہ مقام ہے جہاں سے اسلام سندھ میں آیا اور پھر جنوب ایشیا میں اسلام پھیل گیا۔ اسلام کا ایک بڑا انسان سپہ سالار محمد بن قاسم یہاں اسلام کا پیغام لے کر آیا تھا۔ اس نے شیراز اور بیلا سے سفر کرکے جہاں پہلا پڑاؤ کیا وہ وہی زمین مقدس ہے جہاں آج مدینتہ الحکمتہ بن رہا ہے۔ کراچی کا محل وقوع ایسا ہے کہ یہاں سے دنیا بھر سے براہ راست تعلق قائم ہوتا ہے۔ ہوا کے راستے، پانی کے راستے اور زمین کے راستے۔ افغانستان، ایران، ترکی وغیرہ خشکی کے راستے جایا آیا جاسکتا ہے اور اب روس کی گرفت سے آزاد مسلمانوں کے ملک بھی

کراچی سے براہ راست خشکی کے راستے مل سکتے ہیں۔

کراچی کی یہ مرکزیت ہے اس لیے پاکستان کا مدینتہ الحکمتہ یہاں قائم کیا گیا ہے۔

نونہالو ! میں نے تمہارے سوال کا جواب دے دیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ مدینتہ الحکمتہ اب تم جانتے ہو کہ کیا ہے اور آئندہ یہ کیا بننے والا ہے۔

پسندیدہ کھانا

نونہالو ! اس بات میں میں تمہارے بہت سے سوالوں کے جواب ایک جگہ دوں گا۔

میرا پسندیدہ کھانا وہ ہے جس میں انتہا درجہ سادگی ہو۔ میں جب بھی کھانا کھاتا ہوں تو میں اس حقیقت کو اپنے سامنے رکھتا ہوں کہ شہنشاہ کونین حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حق تعالیٰ جل شانہ سے جا ملے تو اس شام ان کے گھر میں چولھا نہیں جلا تھا۔ پھر نونہالو! میں یہ بھی جانتا ہوں کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھوک کی حالت میں پیٹ پر پتھر باندھے ہیں۔ اور نونہالو! میں یہ بھی خوب جانتا ہوں کہ ہادی برحق صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا کھانا چھوڑ کر ان کو پیش کردیا جو ان سے زیادہ بھوکے تھے۔

تو نونہالو ! مجھے یہ حق نہیں پہنچتا کہ میں کھانا کھاؤں اور وہ سادہ نہ ہو۔ مسلمان کی حیثیت سے میرا فرض ہے کہ میں کھانے میں سادگی

اختیار کروں۔ اگر کوئی میری دعوت کرے اور مجھے ایک سادہ روٹی اور پیاز کی ایک گٹھی کھانے کو دے تو میں اس سے بڑا خوش ہوں گا۔

تو نونہالو ! جانتے ہو کہ میں ''ایک ناشتا اور ایک کھانا'' کا قائل ہوں اور میں تم سے اور پوری قوم سے کہتا ہوں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے مطابق صبح اچھا ناشتا کرو تاکہ تم تمام دن دل لگاکر کام کرسکو اور مغرب کے بعد کھانا کھالو۔ یہ غذا تمھاری حقیقی جسمانی ضرورت کے لیے کافی ہے۔ قرآن کریم' حدیث نبویؐ اور سائنس سب اس کی تائید میں ہیں۔

نونہالو ! اب بات کھانے کی آتی ہے تو ایک بات تم اور بھی سن لو۔ ایک حدیث شریف ہے : ''گائے کے گھی اور دودھ میں صحت اور اس کے گوشت میں مرض ہے۔''

نونہالو ! ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی چودہ سو سال پہلے کا ہے۔ آج سائنس دانوں نے یہ بات کی ہے کہ گائے کا گوشت سخت نقصان پہنچانے والا ہے۔ اس سے آنتوں کا سرطان پیدا ہو رہا ہے اور ہاں آج سائنس دانوں نے خالص مکھن اور دودھ کی تعریف کی ہے۔ اس کے کھانے سے کوئی نقصان نہیں ہے۔ ہاں مصنوعی مکھن (مارجرین) بے حد خطرناک ہے!

اب نونہالو ! تم غور کرو اور سب لوگ غور کریں۔ ہم جو گائیں ذبح کر کر کے رات دن کھا رہے ہیں یہ کس قدر غلط ہے۔ ہماری عقل پر ماتم کہ ہم مضر گوشت کھا کر اپنی صحت تباہ کر رہے ہیں اور دودھ باہر سے

منگوا رہے ہیں جو نہ جانے دودھ کے نام پر کیا ہے۔

نونہالو ! ایک بات اور بتادوں۔ میں نے کبھی چائے نہیں پی۔ اس کا مزہ تک نہیں چکھا، سگرٹ کو کبھی منھ سے نہیں لگایا اور شراب؟ اس منحوس کے تو کبھی قریب بھی نہیں گیا۔ میری اچھی صحت کا ایک راز یہ بھی ہو گا۔

پسندیدہ پھول

بھئی سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے تو ہر نونہال پھول دکھائی دیتا ہے۔ ادھر نونہال کھلتا ہے ادھر میرا دل کھلتا ہے۔ آنکھیں بند کروں تو ہر پھول کی خوش بو پسند اور آنکھیں کھول کر دیکھوں تو گلاب پر جاکر نگاہ ٹھیر جاتی ہے! رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی تو گلاب پسند تھا!

پسندیدہ ملک

میرا پسندیدہ ملک بس اول و آخر پاکستان ہے۔ میرے نزدیک اس سے اچھا اور کوئی ملک نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس پاکستان کو ہر نعمت سے مالا مال کیا ہے۔ یہ میرا ملک ہے۔ مجھے پیارا ہے۔ یہ میرا وطن ہے، مجھے عزیز ہے۔ یہ میرا دیس ہے اور ہر پردیس سے اچھا ہے۔

اگر نونہالو ! تم پاکستان کی بات کر رہے ہو تو مجھے پاکستان کا ہر شہر

پسند ہے۔ شہر کیا مجھے تو پاکستان کا ہر دیہات بھی پسند ہے۔ سوال در اصل یہ ہے کہ شہر اور دیہات میں تم کو انسانوں سے کتنی محبت ہے؟ اور وہاں کے انسانوں کو تم سے کتنی الفت ہے؟ اگر محبت اور الفت دونوں طرف ہے تو اس سے بڑی پسند اور کیا ہو سکتی ہے! ہاں اگر دنیا کے کسی بھی شہر میں الفت اور محبت دونوں طرف ہو تو ہر شہر اور ہر قریہ پسند ہے۔ میں تو محبت کرتا ہوں اور الفت کا بھوکا ہوں۔ جہاں یہ مل جائیں دل لگ جاتا ہے۔

پسندیدہ شخصیت

میری پسندیدہ ہر وہ شخصیت ہے کہ جو انسان سے محبت کرے۔ انسان کا احترام کرے۔ میں کسی ایسے انسان کو پسند نہیں کر سکتا جو انسان سے محبت نہ کرے اور انسان کا احترام نہ کرے۔ میں ہر اس انسان سے محبت کرتا ہوں اور اسے پسند کر سکتا ہوں جو علم اور عالم کا احترام کرے۔ پاکستان میں محبت اور احترام کا شدید قحط ہے۔ نونہالو ! یہ بڑی تکلیف دینے والی ریت ہے کہ آج دنیا میں اس آدمی کا احترام کیا جاتا ہے جو طاقت ور ہو۔ ایسا طاقت ور جو نقصان پہنچا سکے۔ یہاں طاقت کا احترام کیا جاتا ہے۔ آج کا حاکم بھی اس آدمی کا احترام کرتا ہے جو اسے نقصان پہنچانے کی طاقت رکھتا ہے۔ ایسے احترام میں محبت کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ یہ زبردستی کا احترام ہے۔ یہ دکھاوے کی محبت ہے۔ نونہالو !

منافقت سب سے بڑا گناہ ہے۔ میں منافق نہیں ہو سکتا، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں سمجھنا کہ مجھے کوئی شخصیت پسند نہیں۔ میرے بہت سے دوست ہیں، وہ مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ میں ان سے محبت کرتا ہوں۔ ہم سب دوست ایک دوسرے سے مل کر خوش ہوتے ہیں۔ میں دوستوں کے کام آنے کی بھی کوشش کرتا ہوں اور جب کسی کا کام کرتا ہوں تو میرا دل خوش ہوتا ہے۔

پاکستان ہی میں نہیں، دوسرے ملکوں میں، بلکہ دنیا کے بہت سے ملکوں میں میرے بڑے اچھے دوست ہیں۔ ان دوستوں سے میں نے بہت کچھ سیکھا بھی ہے اور جب بھی موقع ملتا ہے ہم ایک دوسرے سے علمی تبادلِ خیال کرتے ہیں اور اس طرح ذہنی قوت اور قلبی فرحت حاصل کرتے ہیں۔ عالم کی صحبت سے علم میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ بہت سی باتیں جو ہمیں کتابوں کے برسوں کے مطالعے سے حاصل نہیں ہوتیں وہ پڑھے لکھے دوستوں اور رفیقوں کی صحبت سے حاصل ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح سفر سے بھی انسان بہت کچھ حاصل کرتا ہے۔ خیر سفر کی بات میں بعد میں کروں گا، پسندیدہ شخصیت کی بات ہو رہی ہے تو میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اگر میں کسی ایک شخصیت کا نام لے سکتا ہوں تو وہ میرے بڑے بھائی محترم حکیم عبدالحمید صاحب ہیں جن کو میں بھائی جان کہتا ہوں۔ بھائی جان میری آئیڈیل شخصیت ہیں۔ انھوں نے مجھے بنایا ہے۔ میری تربیت کی ہے۔ مجھے زندگی کا قرینہ اور جینے کا سلیقہ سکھایا ہے۔ مجھے کھیل کود سے ہٹا کر کام کرنے کا راستہ بتایا۔ مجھے محنت کی عظمت سمجھائی۔ وہ

خود محنت کے عادی ہیں۔ وقت کے پابند ہیں۔ بااصول ' رحم دل ' دوست نواز' کام اور اہلیت کے قدر دان ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ نہایت سادہ اور انتہائی منکسر المزاج ہیں۔ ان کو دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ اتنے بڑے آدمی ہیں' لیکن وہ عظیم انسان ہیں۔ مجھے حکیم محمد سعید انھوں نے ہی بنایا ہے۔ ان سے زیادہ مجھے کوئی شخصیت پسند نہیں ہے۔

پسندیدہ کتاب

نونہالو ! جب میں گیارہ بارہ سال کا تھا تو اپنی "پاکٹ منی" سے میں نے سب سے پہلی کتاب جو خریدی وہ کتب خانہ علم و ادب' اردو بازار' جامع مسجد دہلی سے فلسفے کی کتاب "استدلال" خریدی۔ کتب خانہ علم و ادب میں ایک میرے بڑے پیارے دوست مولانا ولی اشرف صبوحی کے بھائی وصی اشرف تھے۔ وصی اشرف صاحب نے مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا اور کتاب میرے حوالے کردی۔ تو بھئی ایک تو پسند یہ ہوئی۔ مگر یہ دنیاوی پسند ہے۔ میری روحانی پسند کی صاف بات یہ ہے کہ مجھے "قرآن حکیم" سب سے زیادہ پسند ہے۔ تین سال کی عمر سے اب ۷۲ سال کی عمر تک اس کتاب کو روزانہ پڑھتا ہوں اور ہر بار مجھے اس میں نئی نئی باتیں مل جاتی ہیں۔

پسندیدہ شاعر

اچھا ہوا میرے نونہالو ! تم نے سوال کیا ہے کہ "آپ کا پسندیدہ شاعر" کون ہے۔ ایک شاعر کی بات نہیں کی ہے۔ دیکھو میاں! اول تو میں خود شاعر نہیں ہوں۔ اس لیے میرے دل میں کوئی رشک ہے نہ حسد۔ میں تو یہ دیکھتا ہوں کہ کس شاعر نے انسان کے احترام اور انسان سے محبت کی بات کی۔ ایسا شاعر جو آزادی کا درس دے، صراط مستقیم کی طرف آنے کی دعوت دے، انسان کی عظمت اور رفعت کی بات کرے مجھے فوراً پسند آجاتا ہے۔ غالب، حالی اور اقبال میں یہی خصوصیات ہیں۔

میرے شفیق استاد حضرت مولانا قاضی سجاد حسین صاحب نے مولانا رومیؒ کی مثنوی کا اردو ترجمہ کیا ہے۔ میں اپنی شاگردی کے وقت سے مولانا رومی کا مطالعہ کرتا رہا ہوں اور میں نے اپنی ایک کتاب کا نام بھی سعدی کی گلستان کے انداز پر نورستان رکھا ہے، جو میرے دینی مضامین کا مجموعہ ہے۔ فارسی زبان میں سوجھ بوجھ تو حاجی بابا اصفہانی اور سعدی کی گلستان سے آئی، مگر مولانا رومی کے کلام نے فارسی سے قریب کردیا اور بالآخر مولانا سے قریب کردیا! یعنی اللہ والے سے ملادیا!

حضرت جوش اگر "یادوں کی برات" تحریر نہ فرماتے تو اچھا ہوتا۔ میں ان کو قادر الکلام مانتا ہوں۔ ان سے محبت اس لیے کرتا ہوں کہ سورۂ رحمان کا انھوں نے ایسا منظوم ترجمہ کیا ہے کہ دوسرے کو یہ مرتبہ حاصل نہیں ہوا۔ فیض احمد فیض صاحب کے ساتھ روس میں بھی رہا

ہوں۔ میں نے آب جوئے تاجکستان میں ان کا کلام ان کو فرفر سنایا تو وہ جھوم اٹھے تھے! میرے لیے میرے دوست پروفیسر محمد عاصموف (صدر تاجکستان اکیڈمی اوف سائنس) کی داد کافی تھی!

شریک حیات

نونہالو! پسندیدہ کے بیان میں تم نے میری شریک حیات کا سوال خوب کیا۔ شاید تم نے یہ جان لیا کہ میری پسندیدہ شخصیت ایک وہ مرحومہ بھی تھیں! بڑے مزے کی بات یہ ہے کہ گھر کی جس کوٹھڑی میں وہ مجھ سے چار سال پہلے پیدا ہوئی تھیں ٹھیک اسی جگہ میں بھی کوچہ کاشغری، دہلی میں پیدا ہوا تھا! وہ کافی عرصہ اپنے والد محترم کے ساتھ کھڑگ پور (مغربی بنگال) میں رہیں۔ پھر دہلی آگئیں۔ ان کا نام نعمت بیگم تھا۔ اگر ان سے خاندانی مصلحتوں کی وجہ سے میری شادی نہ ہوتی تو میری شادی نیوزی لینڈ میں ہوتی!

نونہالو! خاندانی مصلحت سے زیادہ یہ اللہ تعالیٰ کی مصلحت تھی۔ اگر ایسی معصوم شریک حیات مجھے نہ ملتیں تو شاید میں وہ سارے کام نہ کرسکتا کہ جو میں نے کرلیے ہیں۔ انھوں نے ہر تکلیف برداشت کرکے میری راحت کو ہر راحت پر مقدم رکھا۔ جب غربت کا دور دورہ تھا تو بھی وہ ثابت قدم رہیں۔ ہم دونوں نے خاموشی سے فاقے بھی کرلیے۔ پھر جب کراچی میں ہمدرد کے قیام کا وقت آیا تو اس عظیم خاتون کے پاس جو

زیور تھا وہ سب مجھے دے دیا اور ہمدرد کے قیام میں اس عظمت نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔

اس کے بعد ۱۹۵۲ء سے اپنے مرنے تک نہ زیور مانگا اور نہ پہنا، موٹا جھوٹا پہن کر زندگی گزار دی۔ نونہالو ! جب نعمت بیگم کا انتقال ہوگیا تو بعد میں معلوم ہوا کہ درجنوں ایسے خاندان تھے جن کو وہ ہر مہینے خاموشی سے اناج وغیرہ پہنچایا کرتی تھیں۔ میں نے ان کے مرنے کے بعد ایسے ایک انسان کو تلاش کیا جو ان کی کوئی شکایت کر سکے تو ایک نہ ملا۔ وہ سب کی پسندیدہ اور میری محبوب شخصیت تھیں۔

زندگی کا مقصد

نونہالو ! اگر تم نے میری یہ کہانی غور سے پڑھی ہے اور سنی ہے تو پھر یہ سوال کیوں کرتے ہو کہ "آپ کا مقصد حیات؟" میں نے تو اس کہانی میں اپنی زندگی کا مقصد حیات باتوں باتوں میں سب بتا دیا ہے۔

کیا اس سے بھی بڑا کوئی مقصد حیات ہو سکتا ہے کہ انسان انسان کی خدمت کرے اور انسان انسان کا احترام کرے؟

نونہالو ! میں ۷۲ سال تک انسانوں کی خدمت کرتا رہا ہوں اور ہر لمحہ انسانوں کا احترام کرتا رہا ہوں۔ اب اس محبت و احترام کا آخری مظہر مدینتہ الحکمتہ ہے۔ میرے نزدیک یہ بھی ایک بڑا مقصد حیات ہے!

تمھاری کیا رائے ہے میرے پیارے نونہالو؟

نونہالوں کے لیے
حکیم محمد سعید کے سفرنامے

حکیم محمد سعید نے نونہالوں کی دوسری کتابوں کے علاوہ کئی ملکوں کے سفر نامے بھی لکھے ہیں۔ ان سفر ناموں میں ان ملکوں کے دل چسپ حالات، وہاں کے قابل دید مقامات اور تاریخی جگہوں کی تفصیلات، لوگوں کے طور طریقے، تعلیمی اور سائنسی ادارے، اہم شخصیات اور دوسری معلومات کو حکیم صاحب بڑی مزیدار زبان میں بیان کرتے ہیں۔

(۱)	یہ ترکی ہے	-/۱۰	(۲)	بحر اوقیانوس کے پار	-/۲۰
(۳)	سعید سیاح فن لینڈ میں	-/۲۵	(۴)	ڈیلفی سے سونے کی کان تک	-/۳۰
(۵)	لندن اور کیمبرج	-/۱۵	(۶)	دہلی میں تین دن	-/۱۰
(۷)	سعید سیاح چین میں	-/۳۰	(۸)	سعید سیاح تونس میں	-/۳۵
(۹)	سعید سیاح قاہرہ میں	-/۲۵	(۱۰)	یہ جاپان ہے	-/۳۰
(۱۱)	تین دن بغداد میں	-/۱۲	(۱۲)	سعید سیاح ترکی میں	-/۳۰

